وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد أُوتِيَ خَيرًا كَثِيرًا

اہل السنۃ والجماعۃ

تحریر خلدونِ عصر

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

مجلسِ نشریاتِ اسلام
۱۔ کے ۔ ۳ ناظم آباد مینشن ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

وَمَن یُّؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیرًا کَثِیرًا

اہلُ السُّنَّۃ وَالجُمَاعۃ

(اصطلاح کی لُغوی ومعنوی تشریح، اس کا تاریخی تعین، مذہب
کے اُصولِ اوّلین کی تحقیق اور معقول ومنقول کا اصولِ تطبیق پر توضیح)

تحریر، خلدونِ عصر

حضرت علاّمہ سیّد سُلیمان ندوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۱۳۷۳ھ

مجلس نشریات اسلام

۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد ۱، کراچی ۱۸

پاکستان میں جملہ حقوق طباعت واشاعت
بحقِ فضلِ ربی ندوی محفوظ ہیں

باجازت خصوصی علامہ مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب

نام کتاب ———— اہل السُنّۃ والجماعۃ
تصنیف ———— علامہ سید سلیمان ندویؒ
طباعت ———— تشکیل پرنٹنگ پریس کراچی
اشاعت ———— ۱۹۹۷ء
ضخامت ———— ۱۰۰ صفحات

ٹیلیفون

۶۲۱۸۱۴

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳۰ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱، کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
دیباچہ	۷
ایک سوال	۸
تمہید	۹
سنت وجماعت	۹
بدعت	۱۰
صلاح کے بعد فساد کیسے ہوتا ہے ؟	۱۴
جماعت کا فلسفہ	۱۵
اسلام میں جماعت شکنی	۱۹
اختلافِ صحابہ اور مختلف فرقوں کی پیدائش	۲۳
اہل السنّۃ یعنی ناطرفدار گروہ	۲۴
اہلِ سنّت کلام میں	۲۸
عرب اور عجم کے خصائص ذہنی	۲۸
کوفہ اور بصرہ کے شہر کیوں اختلافات کا مرکز بنے ؟	۲۹

عنوان	صفحہ
مشاجرات صحابہ کے بعد اختلافِ افکار	۳۰
اہل السنّتہ کا فیصلہ	۳۰
فرقوں کی ملکی تقسیم	۳۳
بنوامیہ کے دور میں مذہبی فرقوں کا ظہور	۳۳
فرقوں کا انتشار	۳۵
ضلالت کے طبعی اسباب	۳۹
خیال آرائی	۳۹
عقائد میں وسعت طلبی	۴۰
تاویلِ متشابہات	۴۱
اشاعرہ، حنابلہ اور ماتریدیہ	۵۴
قدماء کے نزدیک اہل سنت کے معنی	۵۸
مسئلہ تقدیر یا جبر و قدر	۷۰
صفات	۷۱
قرآن	۷۲
استواء	۷۴

عنوان	صفحہ
بعض شبہات کا ازالہ	۷۶
اہل السنّۃ کے عقائدِ صحیحہ	۸۰
عقائد کی افادیت	۸۰
اہل سنّت کے عقائد	۸۱
ضمیمہ	۹۷
تشریح اصطلاحات	۹۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

یہ رسالہ ایک مسلسل مضمون کی شکل میں پہلے معارف میں شائع ہوا تھا، بعد کو ۱۹۱۸ء میں یا اس کے پس وپیش احباب کے اصرار سے الگ رسالہ کی صورت میں چھپا، اور مقبول ہوا مدت سے یہ ناپید تھا، اور احباب کا تقاضا تھا کہ یہ دوبارہ چھپے، مگر چونکہ وہ عہد شباب کا لکھا ہوا تھا اس میں قلم کی تیزی، اور کہیں لہجہ کی شدت، اور کہیں عبارت میں شوخی تھی اس لئے جی چاہتا تھا کہ اُس پر نظر ثانی کی جائے، بحمد اللہ کہ یہ فرصت کراچی میں ملی، اور پچھلی تحریر میں حک واصلاح کی گئی، اور آخر میں عقائد کی افادیت اور عقائد کی تفصیل کا اضافہ کیا گیا، تاکہ عام مسلمان اہل سنّت کے صحیح عقائد سے واقف ہوں،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو مستفید فرمائیں،

آمین

والسلام

سید سُلیمان ندوی
دار الحکومت کراچی
۲، شوال ۱۳۷۱ھ

ایک سوال

"قوموں ملکوں اور ممتاز افرادِ انسانی کی تاریخ بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ وہ کیا تھے اور کیا ہوگئے لیکن کبھی اس پر بھی تم نے غور کیا کہ الفاظ کی بھی کوئی تاریخ ہوسکتی ہے ؟ کیا قوموں ، ملکوں اور انسانوں کی طرح ان میں بھی انقلابات کا مد و جزر ہے جس سے دنیا کا ایک ذرہ بھی مستثنیٰ نہیں ؟"

(حضرت علامہ ندویؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ وَالصَّلوٰۃ وَالسَّلام علیٰ سیّد
المرسلین وآلہ واصحابہ اجمعین،

تمہید: مسلمانوں میں ہر دور میں سینکڑوں فرقے پیدا ہوئے، لیکن وہ نقش برآب تھے، اُبھرے اور مٹ گئے، لیکن جو فرقہ عموم اور کثرت کے ساتھ باقی ہے، اور آج مسلمان آبادی کا کثیر حصّہ بن کر اکناف عالم میں پھیلا ہے وہ فرقہ "اہل سُنّت والجماعۃ" ہے، عام طور سے اہل سنّت کے معنی ہندوستان میں یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو شیعہ نہ ہو، لیکن یہ اس کا اثباتی پہلو نہیں ہے، یہ تو منفی پہلو ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی خفیقت کو پوری طرح سمجھا جائے۔ اس لیے ہم کو "اہل السنۃ والجماعۃ" کے ایک ایک لفظ کے معنی پر غور کرنا چاہیئے۔

سُنّت وجماعت: "اہل سُنّت والجماعۃ" تین لفظوں سے مرکب ہے، اہل کے معنی اشخاص، مقلّدین، اتباع اور پیرو کے یہاں ہیں، "سنّت" عربی میں راستہ کو کہتے ہیں اور مجازاً اصول مقررہ، روش زندگی اور طرزِ عمل کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں یہ لفظ متعدد دفعہ انہیں معنوں میں آیا ہے، فرمایا ہے۔

وَلَن تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللہِ تَبدِیلاً، اللہ کی سُنّت میں تم تبدیلی

نہ پاؤ گے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلاً ، اللہ کی سنت میں تم تبدیلی نہ پاؤ گے
سُنَّۃَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ، ان کا راستہ جو پہلے گذرے،

اسی طرح احادیث میں سُنّت کا جو لفظ آتا ہے، اس کے معنی حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصولِ مقررہ اور طرزِ عمل کے ہیں۔ اسی لیئے اصطلاحِ دینی میں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرزِ زندگی اور طریق عمل کو "سنت" کہتے ہیں۔ جماعت کے لغوی معنی تو گروہ کے ہیں، لیکن یہاں جماعت سے مراد "جماعت صحابہؓ" ہے۔ اس لفظی تحقیق سے "اہل سنت والجماعۃ" کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے، یعنی یہ کہ اس فرقہ کا اطلاق اُن اشخاص پر ہوتا ہے جن کے اعتقادات اعمال اور مسائل کا محور پیغمبر علیہ السلام کی سنتِ صحیحہ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اثر مبارک ہے، یا یوں کہئے کہ جنہوں نے اپنے عقائد اور اصولِ حیات اور عبادات و اخلاق میں اس راہ کو پسند کیا جس پر رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام عمر بھر چلتے رہے، اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اُس پر چل کر منزلِ مقصود کو پہنچے۔

بدعت: "سنت" کا مقابل لفظ "بدعت" ہے، بدعت کے لغوی معنی "نئی بات" کے ہیں، اصطلاحِ شریعت میں اس کے یہ معنی ہیں کہ مذہب کے عقائد یا اعمال میں کوئی ایسی بات داخل ہو، جس کی تلقین صاحبِ مذہب

نے نہ فرمائی ہو، اور نہ اُن کے کسی حکم یا فعل سے اس کا منشا ظاہر ہوتا ہو۔ اور نہ اس کی نظیر اس میں ملتی ہو، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اِن دو لفظوں کو انہیں معنوں میں مستعمل فرمایا ہے، اور کبھی "سنّت" کے بجائے "ہُدیٰ" اور بدعت کے بجائے "مُحدَث" فرمایا ہے لغت میں بھی یہ الفاظ مترادف ہیں، ہُدیٰ طریقہ کو کہتے ہیں، اور مُحدَث کے معنی "نیا"۔

صحیح مُسلم میں آپ کا وہ خطبہ مذکور ہے جس کو دیتے ہوئے آپ کی آنکھیں سُرخ ہوجاتی تھیں، آواز بلند ہوجاتی تھی، اور لہجہ غضبناک ہوجاتا تھا۔

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ	بعد اس کے بہترین کلام خدا کا کلام ہے،
اللّٰه وَخَیْرُ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ وَ	بہترین طریقہ محمدؐ کا طریقہ ہے۔ بدترین امور
شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَکُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ	نئی باتیں ہیں، اور ہر نئی بات گمراہی ہے۔

مسند احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے۔

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ	میرا طریقہ اور میرے ہدایت یافتہ جانشینوں
الرَّاشِدِیْنَ تَمَسَّکُوْا بِهَا وَعَضُّوْا	کا طریقہ اختیار کرو، اس کو اچھی طرح
عَلَیْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتُ	پکڑے رہو، اور اس کو دانت سے دبائے
الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَ	رہو، ہاں نئی باتوں سے بچنا، ہر نئی
کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ،	بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے،

ابو داؤد، ترمذی، اور ابن ماجہ میں ہے۔

ایاکم والمحدثات فان کل محدثۃ ضلالۃ،

نئی باتوں سے بچنا، ہر نئی بات گمراہی ہے۔

اس قسم کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ہیں، ان روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "نئی بات" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے موقعوں پر آگئی ہے، بخاری اور مسلم دونوں میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد،

ہمارے اس مذہب میں یا تعلیم میں جو ایسی نئی بات داخل کریگا جو اس میں نہیں تو وہ بات مردود ہے،

صحیح مسلم میں ہے۔

من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد

جو کوئی ایسا کام کرے گا جس پر ہمارا مذہب نہیں وہ رد ہے۔

ابوداؤد میں بایں الفاظ ہے۔

من صنع امراً علی غیر امرنا فھو رد،

جس نے ہمارے عمل یا مذہب کے خلاف کوئی کام کیا وہ رد ہے۔

ان احادیث سے یہ واضح ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم دنیا میں لائے، جن عقائد کی تلقین آپ نے اپنی اُمت کو فرمائی، مذہب

کا جو طریقۂ عمل آپ نے متعین فرمایا اس میں باہر سے اضافہ **بدعت** ہے، اس سے بدعت کی حقیقت ظاہر ہوئی، اور وہ یہ ہے کہ بدعت دینِ حق کے اندر کسی ایسی چیز کا باہر سے اضافہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اور بتائے ہوئے دین میں نہیں، نہ اس کی اصل موجود ہے اور نہ اس کی نظیر موجود ہے، اور نہ وہ قرآن وحدیث سے مستنبط ہے، اور چونکہ دین کے ہر کام میں اجر اور ثواب کا وعدہ ہے اس لیئے جب کسی چیز کو دین یا داخل دین سمجھا جائے گا تو اس پر ثواب بھی مرتب سمجھنا ضروری ہے، اس لیئے اگر کوئی چیز بدعت ہو تو یقیناً وہ ثواب سے خالی ہوگی، بلکہ بوجہ اس کے مردود ہونے اور ضلالت ہونے کے اس کے کرنے سے ثواب کے بجائے گناہ ہی ہوگا۔ اب غور کیجئے کہ مسلمانوں کے عقیدوں میں، اعمال میں، عبادات میں اور غمی وشادی و تقریبات میں جو مراسم ثواب سمجھ کر ادا کیئے جاتے ہیں وہ کہاں تک موجبِ ثواب ہوسکتے ہیں۔

اس تشریح سے ظاہر ہوا کہ کسی امر کے بدعت قرار پانے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اضافہ امورِ دین میں ہو، اگر وہ امور دین سے نہیں ہے تو مذہبی حیثیت سے اس کو بدعت نہیں کہیں گے، مثلاً کسی نئی طرز کی کوئی عمارت بنائے، کوئی نئی مشین بنائے، کوئی نیا آلہ ایجاد کرے، سائینس کے کسی مسئلہ کی نئی تحقیق کرے، کوئی نیا طریقۂ علاج ایجاد کرے، وغیرہ

بدعت کی پہچان یہ ہے کہ اس کا کرنے والا اپنے اس کام میں ثواب کا اعتقاد کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کام میں ثواب یا عذاب کا ہونا عقل سے دریافت نہیں ہو سکتا، اس کی دریافت کی راہ صرف ایک ہے، اور وہ وحیٔ نبوی ہے۔

صلاح کے بعد فساد کیسے ہوتا ہے: کسی قوم میں صلاح کے ظہور کے بعد فساد کا رکیوں کر راہ پاتا ہے، شارع اسلام علیہ الوف التحیۃ والسّلام اس سے بے خبر نہ تھے فرمایا۔

ما من نبی بعثہ اللہ الا کان لہٗ من	خدا نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں فرمایا لیکن
امۃ حواریون، واصحاب یاخذون	اس کے چند خاص اتباع اور پیرو بنائے جو
بسنتہٖ، ویقتدون بامرہ، ثم انھا	اس کی سنّت کو اختیار کرتے ہیں اور اسکے
تخلف من بعد ھم خلوف، یقولون	مذہب کی اقتدا کرتے ہیں پھر انکے بعد ایسی نسلیں
ما لا یفعلون، ویفعلون ما لا یومرون	آتی ہیں جو کہتی ہیں وہ کرتی نہیں اور کرتی ہیں
فمن جاھدھم بیدہٖ فھو مومنٌ و	وہ جس کا انکو حکم نہیں دیا گیا، جو اُن سے اپنے ہاتھ
من جاھدھم بقلبہٖ فھو مومن و	سے جہاد کرے وہ مومن ہے، جو زبان سے
لیس وراء ذالک من الایمان حبۃ	جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو دل سے جہاد
خردل (مسلم)	کرے وہ مومن ہے، اس کے بعد رائی برابر
	ایمان نہیں، (مسلم)

اس سے ظاہر ہوا کہ نبی اپنے معجزانہ اثر اور فیض تعلیم سے اپنے

صحبت یافتوں کی ایک جماعت چھوڑ جاتا ہے، جو اپنے نبی کے طور وطریق اور سنّت سنیّہ کی پورے طور پر متبع ہوتی ہے ا وران کے بعد رفتہ رفتہ ایسے افراد ان کی جگہ لیتے ہیں جو اپنے نبی کی سنّت اور طور وطریق سے دور ہوتے جاتے ہیں، اور وہی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔

جماعت کا فلسفہ: اسلام کے اس حکم قطعی کے بعد کہ صاحبِ شریعت کی تعلیمات اور احکام پر کسی قسم کا اضافہ کرنا یا اُن میں سے کسی جز کو ساقط سمجھنا "سنت" کی بیخ کنی اور "بدعت" کی پرورش ہے، اہل السنّۃ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں، لیکن اس کے بعد "والجماعۃ" کا لفظ سامنے آتا ہے اس لیے "والجماعۃ" کی تفسیر بھی خود صاحبِ شریعت کی زبان سے سُن لینی چاہیئے۔

اسلام دنیا کے تفرقوں کو مٹاکر تمام دنیا کی ایک عمومی برادری قائم کرنے آیا تھا۔ وہ آیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ اس نے عرب کے متفرق قبائل کو جو باہم دشمن یا کم از کم ناآشنا تھے، ان کی قبائلی تقسیم کو مٹاکر صرف "جامعۂ اسلام" کے ایک رشتہ میں ان کو باہم متحد کردیا مہاجرین وانصار میں وہ اخوت پیدا کردی کہ نسبی برادریاں اس کے آگے ہیچ ہوگئیں۔

کسی قوم میں کوئی ترقی اس وقت تک نہیں پیدا ہوسکتی جب تک اُس کے تمام افراد کسی ایک نقطہ پر باہم اس طرح مجتمع نہ ہوجائیں

کہ وہ نقطۂ اجتماع انکی زندگی کا اصلی محور بن جائے، اس کا تحفظ، اس کی بقاء اس کا وجود تمام افراد قوم کی زندگی کی غرضِ اصلی بن جائے، اُس وقت اس مجموعۂ افراد کو ایک ملّت کہا جاسکتا ہے، اور وہی نقطۂ اتحاد ان کا شیرازۂ قومیت، رشتہ جامعیت اور رابطۂ وحدت قرار پائے گا، کسی قوم کی تباہی کا اصلی سبب یہی ہوتا ہے کہ اس کی قومیت کی یہ گرہ کھُل جاتی ہے۔ تمام مجتمع افراد اس طرح متفرق و منتشر ہو جاتے ہیں کہ ہوا کا ایک ادنیٰ جھونکا اُن کو بکھیر دیتا ہے۔

یورپ کے تمام متمدن ممالک کا وجود "جامعۂ وطنیت" کے اندر پوشیدہ ہے۔

ہندوستان کی ترقی کی تمام کوششیں اُس وقت تک بے اثر رہیں گی، جب تک اس کی تمام قوموں میں مذہب، یا وطن، یا زبان کسی چیز کا نقطۂ اتحاد نہ پیدا ہو۔ اسلام نے اپنے سامنے دنیا کی عمومی برادری رکھی ہے، وہ کسی ایک وطن کو، یا کسی خاص جغرافی ملک کو صرف باہم متحد ہی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ تمام دنیا کو متحد کر دینا چاہتا ہے، تاکہ دنیا میں ایک عام امن و سلامتی پیدا ہو جائے، موجودہ جنگ کے مصائب اسی غلطی کے نتائج ہیں، یورپ کا رشتہ اتحاد وطن یا نسل ہے۔ جس کا اشتمال لامحالہ صرف ایک محدود نسلی یا جغرافی ملک پر ہوگا، اس لیئے یورپ میں سیکڑوں جامعیتیں پیدا ہوگئی ہیں۔

اس وقت انگریز جرمن سے نہیں لڑ رہا بلکہ انگلستان جرمنی سے لڑ رہا ہے ۔

اسلام نے جغرافی اور نسلی امتیازات کو جن کے اندر کبھی تمام دنیا نہیں سما سکتی مٹا کر مذہب کو جامعۂ ارتباط اور رابطۂ جامعیت قرار دیا، تاکہ دنیا کے جس حصہ اور انسانوں کی جن نسلوں تک بھی اس کا دائرہ وسیع ہو وہ ایک برادری کے اندر داخل ہو جائیں ۔

اسلام نے بآواز بلند کہا،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (حجرات) مسلمان تو آپس میں "بھائی بھائی" ہیں ۔

اسلام کے پیغمبر نے اس کی تفسیر میں کہا ۔

تری المومنین فی تراحمھم وتوادھم مسلمان باہمی رحم، محبت اور مہربانی میں
کمثل الجسد اذا اشتکی عضو تداعی ایک بدن کی طرح ہیں، دیکھو کہ ایک عضو
لہٗ سائر الجسد بالسھر والحمیٰ ۔ کو بھی درد ہوتا ہے تو تمام بدن بے خوابی
(بخاری ومسلم) اور تپ کی دعوت ایک دوسرے کو دیتا ہے،

پھر فرمایا

المومن للمومن کالبنیان، یشد تمام مسلمان مثل ایک دیوار کے ہیں جس
بعضہ بعضاً، کے ایک حصے سے جڑ کر دوسرا حصہ مستحکم ہو جاتا ہے،

ارشاد ہوا

المسلم اخو المسلم لا یظلمہٗ ولا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس

یسلمہ (بخاری ومسلم)	پر ظلم کرے اور نہ اس کی اعانت ترک کرے

آپ نے فرمایا،

کل المسلم علی المسلم حرام دمہ و	ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان پر تمام چیزیں
مالہ وعرضہ (مسلم)	حرام ہیں اسکا خون اس کا مال اور اس کی آبرو

ایک دفعہ آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

انصر اخاک ظالماً او مظلوماً	اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو

صحابہ میں سے ایک نے عرض کی مظلوم ہو تو مدد کروں گا لیکن ظالم ہو تو کیوں کر مدد کروں، فرمایا، اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رکھو،

امتِ اسلامیہ کی اجتماعی زندگی کی نسبت فرمایا۔

ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالۃ،	اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر مجتمع نہ کریگا
وید اللہ علی الجماعۃ ومن شذ	خدا کا ہاتھ جماعت پر ہے، جو جماعت سے
شذ فی النار (ترمذی)	الگ ہوا وہ دوزخ میں الگ ہوا (ترمذی)
تفترق امتی علی ثلث وسبعین	میری امت تہتر فرقوں پر منقسم ہوگی، بہتر
ملۃ ثنتان وسبعون فی النار	دوزخ میں اور ایک جنت میں اور
وواحدۃ فی الجنۃ وھی الجماعۃ،	وہ جماعت ہوگی،

انہیں معنی کی اور بہت سی حدیثیں مروی ہیں، ان سے "اہل السنۃ" کے بعد "والجماعۃ" کی حقیقت واضح ہوتی ہے، قرآن پاک کی اس آیت

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا،   اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوط پکڑو،

کی یہ سب تفسیریں ہیں، قرآن پاک کی ایک دوسری آیت ہے،

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ   اور نہ چلو کئی راہیں، پھر وہ تم کو ہٹادیں گی
عَنْ سَبِيلِهٖ   (انعام ۱۹)   اللہ کی راہ سے،

اس آیت کی شرح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں یہ مضمون ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھی لکیر کھینچی، اور پھر اس کے دائیں بائیں لکیریں کھینچیں، اور فرمایا کہ یہ سیدھی لکیر تو صراطِ مستقیم ہے اور داہنے بائیں کی اہوا (نفسانی) ہیں، بعض دفعہ صحابہ نے پوچھا، یارسول اللہؐ وہ صحیح راہ کیا ہے، فرمایا،

ما انا علیہ واصحابی   وہ وہ راہ ہے جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں

اسلام میں جماعت شکنی: اسلام میں "سنّت" اور "جماعت" میں سے سب سے پہلے "جماعت" کا اصول ٹوٹا، اس جماعت شکنی نے سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کردیا، یعنی عثمانیہ اور سبائیہ.

یہ فرقے خود صحابہ کے اخیر عہد میں پیدا ہوچکے تھے، سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کے ملکی طرزِ عمل اور سیاسی انتظامات کی بنا پر دو فرقوں کا ظہور ہوا، ایک ان کا حامی اور طرفدار تھا، اور دوسرا ان کا مخالف تھا، پہلا فرقہ تاریخ میں **عثمانیہ** کہلاتا ہے، اور دوسرے کا نام **سبائیہ**

ہے ، (ابن سَبا ایک یہودی نومسلم تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے مخالفین کو ایک شیرازہ میں مجتمع کیا تھا) عثمانیہ خالص عرب تھے . سبائیہ میں عرب و عجم دونوں عنصر شامل تھے، ان دونوں قوموں کے خصائص طبعی بالکل مختلف ہیں، عرب تلوار کے دھنی ہیں اور اہل عجم باتوں میں کام نکالنے کے عادی ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو ہی میدانوں کے بعد یہ فرقہ دو حصّوں میں منقسم ہو گیا، ایک نے اپنے لئے علَویہ یا شیعۂ علی کا لقب پسند کیا، اور دوسرا خوارِج کے نام سے مشہور رہا، پہلے ان کو عموماً حرُورِیہ کہا جاتا تھا، (حرورا ایک مقام کا نام تھا، جہاں اس فرقہ نے اپنی علیٰحدہ ہستی کا سب سے پہلے اعلان کیا) یہ تمام تر عرب تھے، اور نظریۂ سابق کے مطابق اس نے اپنے دعووں کا دو ڈھائی سو برس تک ہمیشہ تلواروں کے ذریعہ سے اعلان کیا اور کبھی اس نے خلفائے عہد کے سامنے سرِ اطاعت خم نہ کیا .

عَلَوِیّہ میں عرب کمتر لیکن اہل عجم کا بڑا حصہ شامل تھا اسی لئے آخرالذکر عنصر میں تلوار کے بجائے سازشوں کا مادہ فطرۃً زائد تھا . اور جو عرب تھے وہ اپنی وفاداری پر قائم رہے انصار کا ایک حصہ عَلَوی تھا اور بعض محدّثین بھی علوی تھے یعنی حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ سے افضل جانتے تھے .

فرقۂ عثمانیہ سو برس تک بنواُمیّہ کی زندگی کے ساتھ قائم رہا

بعض بعض صحابہ اور بعض اکابر محدثین اس فرقہ میں داخل تھے، اسماء الرجال میں بعض محدثین کے حالات کے ضمن میں اس کی تصریح ملتی ہے، کہ وہ عثمانی یا علوی تھے، لیکن بنوامیہ کے زوال کے بعد اس فرقہ کا نام ونشان تک نہ رہا۔

ان فرقوں نے تھوڑے دن کے بعد ملک کی جغرافیائی تقسیم کرلی، عثمانیہ شام میں، علویہ اور حروریہ عراق میں، اور اہل السنۃ حجاز میں۔ ابتداءً عثمانیہ اور علویہ میں صرف اسی قدر فرق تھا کہ عثمانی حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ سے افضل سمجھتے تھے، اور علویہ حضرت علیؓ کو ان سے بہتر جانتے تھے۔ شیخین کی فضیلت پہ دونوں کو اتفاق تھا لیکن رفتہ رفتہ عثمانیہ ناصبیہ ہوگئے، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علی الاعلان نعوذ باللہ بُرا کہنے لگے لامحالہ اس کا ردّعمل ہونا ضرور تھا، علویہ نے نہ صرف بنو اُمیّہ کو بلکہ خلفائے اوّلین کو بھی بُرا کہنا شروع کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علویہ کا یہ فعل بہت بعد میں شروع ہوا کیونکہ صحاح کی کتابوں میں بنوامیہ کی ان شرارتوں، اور خوارج کی بدعقیدگیوں کی تردید صحابہ کی زبان سے مصرح مذکور ہے، لیکن علویہ کی نسبت ان کا کوئی حرف میری نظر سے نہیں گذرا۔

ہم نے لکھا ہے کہ ان سیاسی اختلافات نے مذہبی اختلافات کی بنیاد قائم کی، سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوا کہ جو لوگ جنگ

جمل وصفین وغیرہ میں اِدھر یا اُدھر سے شریک ہوئے اُن میں برسرِحق کون تھا، اور آیا دوسرا فریق اس آیت کا مستحق ہے یا نہیں۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جو کسی مسلمان کو عمدًا قتل کریگا اسکی جزا جہنم
جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

یہ اختلاف سب سے پہلے **کوفہ** میں پیش آیا۔ اور یہیں سے یہ صدا بلند ہوئی، صحابہؓ زندہ تھے، سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس رضؓ کے پاس آئے، اور پوچھا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہے؟ فرمایا نہیں، یہ آخری آیتوں میں ہے (مسلم کتاب التفسیر) خوارج اس کے قائل تھے کہ چونکہ طرفین نے ایک دوسرے پر جان بوجھ کر تلوار اٹھائی، اس لیئے دونوں جہنمی ہیں، چنانچہ اسی اصول کی بناپر ان تمام خانہ جنگیوں میں وہ دونوں جماعتوں کو برابر کا کافر جانتے تھے، اور چونکہ قتلِ عمد گناہ کبیرہ ہے اور اس کے لیئے خدا نے دائمی جہنم کی دھمکی دی ہے جو کافروں کی سزا ہے۔ اس سے وہ ثابت کرتے تھے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب مومن نہیں ہیں، یہ آیت بظاہر خوارج کے اثباتِ مدعا میں ایسی صاف تھی کہ خوارج اپنے خیالات کی اشاعت میں اس سے کامیاب ہوتے تھے،

مسلم میں روایت ہے کہ چند تابعین خوارج کے دلائل سے مطمئن ہو کر خارجی بن گئے۔ تھے اتفاق سے حج کا زمانہ پیش آیا اور اُن کا مدینہ میں گذر ہوا، مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

ایک مشہور صحابی اپنے حلقہ کو درس دے رہے تھے، اُن لوگوں نے اپنے شکوک اُن کے سامنے پیش کیئے، انہوں نے تشفی کر دی، اور ایک کے سوا سب لوگوں نے اپنی سابق رائے سے توبہ کر لی۔

دوسرے فرقوں کے سامنے قرآن مجید کی دوسری آیت تھی۔

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ	اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم کشت و خون
اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ	کریں تو اُن کے درمیان صُلح کرا دو، اور اگر
بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰی	اُن میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے تو
فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ	ظالم جماعت سے لڑو، یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی
اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ (حجرات)	کی طرف رجوع کرے، (حجرات)

علوی اور عثمانی دونوں اس آیت کو اپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے تھے، وہ خود کو برسرِ حق ٹھہرا کر دوسرے فریق کو برسرِ باطل قرار دیتے تھے، اور اس لیے اس پر تلوار اٹھانا جائز سمجھتے تھے۔

اتنے توبرتو پردوں کے اٹھنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ "اہل السنۃ والجماعۃ" کی حقیقت پر ایک اور نقطۂ نظر سے غور کیا جائے

اختلافاتِ صحابہ اور مختلف فرقوں کی پیدائش!

عثمانؓ ذی النورین کے زمانہ کے فتنہ سے لے کر اس وقت تک تین فرقے برابر برابر کے قائم ہو گئے تھے، علویہ، عثمانیہ، حروریہ یا خوارج، ان کی

تعداد تمام ملک میں محدود تھی، یہ تینوں فرقے جس اصلِ عظیم، جس صراطِ مستقیم، اور جس شاہراہ قدیم کو چھوڑ کر الگ الگ راستوں پر پڑ لیے تھے، اسی کا نام "سنت" اور اسی کا نام "جماعت" تھا، اور جو سوادِ اعظم اس راہ پر قدم زن تھا وہی "اہل السنۃ والجماعۃ" تھے، جنہوں نے ایک طرف مذہبی حیثیت سے ان اصول سے جنکی شارعؑ نے تعلیم کی تھی۔ ایک ذرّہ ہٹنا گوارہ نہیں کیا، اور دوسری طرف انتظامی و سیاسی نقطہ سے عامۂ صحابہ، سوادِ اعظم، جمہور اور جماعت کی رائے کے پابند تھے ان تمام خانہ جنگیوں میں کچھ لوگ امیر معاویہؓ کے ساتھ تھے، وہ عثمانیہ تھے کچھ جناب علی مرتضیٰؓ کے ساتھ تھے۔ وہ علویہ تھے، اور کچھ دونوں کو بُرا جانتے تھے، وہ حروری اور خوارج تھے۔ "اہل السنّۃ" وہ تھے جو دونوں میں سے کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے اور اُن کی اصل نیت پر حملہ نہیں کرتے تھے، انکی حیثیت ان تمام خانہ جنگیوں میں "ناطرفدار جماعت" کی تھی، اس لئے "اہل السنّۃ" کسی فریق کے طرفدار گروہ کا نام نہ تھا، بلکہ ناطرفدار گروہ کا نام تھا، وہ ان خانہ جنگیوں کو مذہبی جنگ نہیں، بلکہ سیاسی جنگ سمجھتے تھے، وہ اس کو فتنہ کہتے تھے، اور اس کی شرکت پر عدم شرکت کو ترجیح دیتے تھے۔

اہل السنّۃ یعنی ناطرفدار گروہ: صحابۂ کبار میں سے ان خانہ جنگیوں کے عہد میں ہزاروں صحابہ زندہ تھے، لیکن فریق کی حیثیت سے جن کا نام پیش کیا جا سکتا ہے وہ معدودے چند اشخاص تھے، بقیہ

سوادِاعظم ناطرفداری کی حالت میں تھا، جو بعض اشخاص فریق کی حیثیت سے ادہر یا اُدھر شریک تھے، وہ ایک دوسرے کو نعوذ باللہ فاسق یا کافر نہیں سمجھتے تھے، حضرت عمارؓ بن یاسر، حضرت علیؓ مرتضیٰ کے سخت طرفدار تھے، وہ حضرت عائشہؓ کی فوج کے مقابل میں اہل کوفہ کو شرکت جنگ کے لئے اُبھارتے ہیں تو یہ الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے ہیں

انّی لَاَعلم انّھا لزوجتہ فی الدنیا	میں جانتا ہوں کہ وہ دنیا میں آپکی بیوی تھیں
وَالاٰخرۃ ولکنّ اللہ ابتلاکمُ	اور آخرت میں بھی آپکی بیوی رہیں گی یعنی جنتی
لتتبعوہ او ایاھا.	ہیں لیکن خدا تم کو آزماتا ہے کہ اُنکا ساتھ دیتے
	ہو یا ان کا دیتے ہو۔

حضرت زبیرؓ کے قاتل نے جب حضرت زبیرؓ کا سر مبارک حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا ابن صفیہ کے قاتل کو جہنم کی بشارت ہو، ہم ہی وہ ہیں جنکی شان میں خدا نے فرمایا ہے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ	ان (اہل جنت) کے سینوں کی عداوتیں ہم
مِنْ غِلٍّ اِخْوَاناً عَلیٰ سُرُرٍ	نے دور کر دیں اور وہ جنت میں بھائی بن
مُتَقَابِلِیْنَ،	کر آمنے سامنے تخت پر بیٹھے ہوں گے۔

امیر معاویہؓ کو حضرت علی سے جس قدر سیاسی اختلاف تھا وہ پوشیدہ نہیں لیکن جب علمی و دینی ضرورت پیش آئی تو ان کو اسی بارگاہ کی طرف

---

[1] طبری

رجوع کرنا پڑا[۵]، حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ کے مقابل فوج لائی تھیں، لیکن دینی ضرورتوں کے موقع پر انہوں نے بھی حضرت علیؓ کے پایہ سے انکار نہیں کیا[۶]۔

بہرحال ان روایتوں سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ ان بعض چند صحابہ میں جو اختلاف تھا، وہ فرقہ بندی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اختلاف رائے کی حیثیت رکھتا تھا، اس بنا پر سواد اعظم نے ان خانہ جنگیوں کو "خطا اجتہادی" سے تعبیر کیا، قرآن کی جو چند اوپر نیچے کی آیتیں علویہ اور عثمانیہ ہم کو سنا کر رہ گئے تھے، وہ پوری آیتیں ہم کو سناتے ہیں۔

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ
بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى
فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰى
اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ
اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ،

اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑیں تو اُنکے
درمیان صلح کراؤ اور اگر اس میں سے ایک دوسرے
پر ظلم کرے اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا
کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے تو اُن میں
صلح کراؤ۔ خدا اہل انصاف کو دوست
رکھتا ہے۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی
ہیں۔ اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح
کراؤ، اور خدا سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

وہ صحابہ جو ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوئے۔ اسلام کی تباہی

---

[۵] سنن سعید بن منصور [۶] مسلم، المسح علی الخفین۔

پر اُن کے پر درد کلمات، اور زمانۂ فتن کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور نصائح جس حسرت اور افسوس کے ساتھ بیان کرتے تھے، اب تک اُن کے پڑھنے سے آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں، فاتح ایران حضرت سعد وقاصؓ خانہ نشین ہو گئے تھے، اور کہتے تھے کہ اگر میرے گھر آکر بھی کوئی مجھ پر تلوار چلائے تو میں اپنا ہاتھ اُس پر نہ اٹھاؤں گا"۔

اہسل بن حنیفؓ سے عدم شرکت کی وجہ پوچھی گئی تو کہا" میں نے جب اپنی تلوار میان سے نکال کر کندھے پر رکھی ہے تو دفعتہً تمام مشکلیں حل ہو گئی ہیں لیکن موجودہ مشکلات کی نسبت میں نہیں جانتا کہ کیا کروں"

حضرت علیؓ نے ایک بزرگ سے شرکت کی درخواست کی، انہوں نے عرض کی" میرے دوست اور آپ کے چچیرے بھائی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا ہے کہ جب ایسا وقت آئے تو لکڑی کی تلوار رکھنا، سو وہ لکڑی کی تلوار لے کر چل سکتا ہوں" حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابوبکرہؓ نے لوگوں کو بتایا کہ" یہ وہ زمانہ ہے جس میں سونے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے، کھڑا ہونے والا چلنے والے سے، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہے"۔

چند ایسے صحابہ بھی تھے، جو اُس زمانہ میں گھروں کو چھوڑ کر گاؤں اور پہاڑوں میں چلے گئے تھے، ایسے بھی تھے جو اپنی رائے کے مطابق

ادھر یا ادھر فوج میں موجود تھے۔ لیکن انہوں نے تلوار نہیں چلائی۔ تاریخ کے ابواب الفتن کو دیکھو تو اس قسم کے واقعات صفحہ صفحہ پر ملیں گے۔

اہل سنّت کلام میں

در راہِ عشق بیر پیشنیاں نہ ایم   ایں شیوہ را بطرزِ دگری کینم ما

گذشتہ اوراق میں "اہل السنتہ والجماعتہ" کی جو تعبیر کی گئی تھی وہ سیاسی فرقوں کے مقابلہ میں تھی، لیکن حالات کے انقلاب سے یہی لفظ ایک اور معنی پیدا کرتا ہے، جس کو ہم لفظ "اہل السنتہ والجماعتہ" کا دوسرا دور کہتے ہیں۔ اس دور کی تشریح کیلئے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے۔

عجم اور عرب کے خصائص ذہنی: جس طرح اشخاص کے فطری خصائص اور اخلاق ہوتے ہیں، اسی طرح قوموں کی بھی فطری خصوصیتیں اور اُن کے طبعی اخلاق ہیں، عرب کی قوم فطرۃً سرتاپا عمل ہے، ایران سرتاپا خیال اور تخیّل ہے، جن لوگوں کی نظر علم کلام کی تاریخ پر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب تک عربوں کا اختلاط ایرانیوں کے ساتھ نہیں ہوا، عربوں کے ہر قسم کے قوائے عملی زندہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دوسری قوموں کی تقلید و مشابہت سے منع فرمایا تھا، اس کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کے قوائے اخلاق، اسلامیت اور عربیت کے صحیح نمونہ پر قائم رہیں حضرت عمرؓ نے مسلمان سپاہیوں کو ایران کی مہم پر روانہ کیا تھا تو ان کو نصیحت کی تھی کہ ایرانیوں سے آرام طلبی کی تعلیم نہ حاصل کریں، غیر قوموں کو مسلمانوں

کے تشبہ اور ان کے طرز لباس کی تقلید سے بھی اس لئے روکا کہ اسلامیت کا جوہر اس اختلاط اور تشابہ سے برباد نہ ہو جائے۔

کوفہ اور بصرہ کے شہر کیوں اختلافات کے مرکز بنے: فتح ایران کے بعد عرب وعجم کے حدود پر فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر کوفہ اور بصرہ کے شہر آباد ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہر عرب وعجم کے مشترکہ اخلاق وخصائص کے نمائش گاہ بن گئے، ان اطراف میں اسلام کے پہلے سے بھی پارسیوں کے وہ فرقے جن کا مذہب سرکاری مذہب کے موافق نہ تھا، اور مجوسیت کے باطل فرقے شمار ہوتے تھے، آباد تھے، چونکہ یہ حکومتِ ایران کی آخری سرحد تھی، اس لئے اُن مذہبی مجرموں کے لئے اس سے بہتر کوئی مامن نہ تھا، عربوں نے فوجی نقطۂ نگاہ سے ان مقامات کو اپنا فوجی مرکز قرار دیا۔

عرب کی خشک آب وہوا میں رنگین طبیعتوں کی پرورش کے لئے عراق کے سبزہ زاروں اور دجلہ وفرات کے کناروں سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی، ان وجوہ سے اس زمانہ میں یہ شہر علم ومذہب اور ادب وتمدن کی دلچسپیوں کے باغ وبہار تھے، لیکن عرب وعجم کے رنگ ومذاق میں جو طبعی اختلاف ہے اس کے اُبھرنے کیلئے بھی اس سے بہتر زمین کا کوئی قطعہ نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ وعمل کی فوجی سرزمین اوہام وخیال کی رزم گاہ بن گئی۔

مشاجراتِ صحابہ کے بعد اختلافِ افکار

لوگ کہتے ہیں کہ رات کو بیماری کی شدت بڑھ جاتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ بیماری کی شدت نہیں بلکہ بیمار کے احساس کی شدت بڑھ جاتی ہے دن کے شور وغل اور حواس کی مصروفیت میں احساس کا کم موقع ملتا ہے، لیکن رات کے خاموش اور غیر مصروف گھنٹوں میں ہمارے احساسات ایک ایک رُونگٹے کو ٹٹولتے ہیں، اور اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔

امام حسنؓ اور امیر معاویہؓ نے جب باہم صُلح کر لی، اور لوگوں کو اطمینان سے غور کا موقع ملا تو ہر گروہ کو اپنے بدن کے زخم جن کے دیکھنے کی پہلے فرصت نہ تھی محسوس ہونے لگے، دن کے شور وغل اور حواس کی غافلانہ مصروفیت کے بعد اب شام ہو رہی تھی اور رات کے گھنٹے آ رہے تھے، عمل کا دور ختم ہو کر اب تخیّل کا دور شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوا، اور یہ کوفہ میں پیدا ہوا کہ ہم اگر حق پر تھے تو دوسرے فریق کی نسبت ہم کیا خیال کریں اور اگر حق پر نہ تھے تو ہم خود مذہبی عدالت میں کیا ٹھہرتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ	جس نے کسی مسلمان کو عمداً قتل کیا اُس
جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا ۔	کی جزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیگا۔

اہل السنّۃ کا فیصلہ

اس بناپر عثمانیہ اور طرفدارانِ معاویہ اپنے کو برسرِ حق سمجھ کر دوسرے کو جہنمی قرار دیتے تھے، علویہ بھی اپنے مخالفین

کی نسبت یہی فیصلہ کرتے تھے۔ خوارج نے کہا کہ دونوں نے جان بوجھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائی اس لیئے دونوں جہنمی ہیں۔ **اہل السنۃ** کا یہ فیصلہ تھا کہ یہ قتل عمد نہیں قتلِ خطا ہے۔ کہ ہر ایک فریق اپنے کو برسرِ حق جان کر اور دوسرے کو برسر باطل سمجھ کر مذہباً اور اعتقاداً دوسرے کا خُون بہانا جائز اور مباح سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کا فیصلہ اُس کے ہاتھ ہے، جو حقیقت حال سے واقف اور نیتوں کے اصل منشاء سے آگاہ ہے[1]

بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ کوفہ سے چند لوگ حضرت **ابن عباس**رضؓ کی خدمت میں آئے، اور ان سے پوچھا کہ یہ آیت منسوخ ہے، فرمایا "نہیں یہ آیت آخر میں اُتری ہے، اس کو کسی نے منسوخ نہیں کیا"مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا "قرآن میں تو یہ ہے کہ ہم مسلمانانِ اوّل کے لئے دعائے مغفرت کریں، لیکن لوگ اُن کو گالیاں دیتے ہیں" امّ المومنین کا اِس آیت پاک کی طرف اشارہ ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاخْوَانِنَا الَّذِیْنَ	خداوندا ہم کو اور ہمارے اُن بھائیوں کو جو
سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ ،	ایمان میں ہم سے پہلے ہیں معاف کر۔

یہ حدیثیں بخاری اور مسلم کی کتاب التفسیر میں ہیں، سلف صالحین

---

[1] یہ فیصلہ بحیثیت خانہ جنگیوں کے ہے ورنہ مناقب اور فضائل کے لحاظ سے حضرت علیؓ کا جو پایہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

اور محدثین اہل سنت نے اصولی حیثیت سے اس مسئلہ کو ذکر کیا ہے، چنانچہ عقائد کی تمام کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے۔

خوارج کے نزدیک چونکہ یہ قتل عمد تھا جو گناہ کبیرہ ہے، اور جس سے دائمی جہنم کا انسان مستوجب ہوتا ہے اور دائمی جہنم کا مستوجب ہونا صرف کافروں کی صفت ہے اس لئے گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے، اس نتیجہ نے خارجی مذہب کے اصولِ اولین کی حیثیت اختیار کر لی، اس کے بالمقابل ایک اور فرقہ ہوا جو **مُرجئیہ** کے نام سے مشہور ہوا، اس نے بعض احادیث کی بنیاد پر یہ دعوی کیا کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں، گناہ سے مومن کسی طرح عذاب کا مستحق نہیں ہوتا ہے، چہ جائے کہ اس سے کفر لازم آئے۔ ایک تیسرا فرقہ **مُعتزلہ** کا ان دونوں کے بیچ میں پیدا ہوا، جس نے دونوں گذشتہ فریقوں کے دلائل سُن کر یہ فیصلہ کیا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر، وہ کفر اور ایمان کے بیچ کی منزل میں ہے۔

اہل السُّنّتہ پھر آگے بڑھتے ہیں، وہ ان فرقوں کی طرح جو صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے، صرف ایک دو آیت یا حدیث کو لے کر فیصلہ نہیں کرتے، اُن کے سامنے قرآن کی تمام آیتیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و ہدایات تھے۔ صحابہ کے آثار اور روایات تھے۔ انہوں نے کہا، گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کفر لازم نہیں آتا لیکن

اس کا مرتکب عذاب کا مستحق ضرور ہو جاتا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی قدرت اور رحمت سے گنہگار کی خطاؤں کو معاف کر دے، اور اسے عذاب سے بچا لے صحیح مسلم میں ہے کہ بعض لوگ خوارج کے دلائل سُن کر خارجی بن گئے. اتفاق سے اُن کا گزر مدینہ میں ہوا، وہاں حضرت جابرؓ سے ملاقات ہوئی، اُن سے پوچھا کہ گنہگار بخشے بھی جائیں گے انہوں نے قیامت کے تمام واقعات اور گنہگاروں کی شفاعت اور مغفرت کی حدیث بیان کی، یہ سُن کر ایک کے سوا سب تائب ہو گئے.

فرقوں کی ملکی تقسیم: ہم نے پہلے لکھا ہے کہ ان فرقوں نے قومی تقسیم کے علاوہ ملکی تقسیم بھی حاصل کر لی تھی، **شام** میں عثمانی و ناصبی وغیرہ حامیانِ بنوامیہ تھے، اور **عراق** میں علوی اور اہلِ عجم تھے، بنوامیہ نے میدانِ **کربلا** میں جگر گوشۂ رسول کے ساتھ جو کچھ کیا، سرزمینِ حرم میں صدیقؓ کے نواسہ (ابن زبیرؓ) کو جس بیدردی کے ساتھ قتل کیا، امام زین العابدین کے دلبند. زید شہید کا سر جس طرح اُتارا گیا، **مدینۃ الرسول** میں انصار کرام کو جو رسولؐ کے دست و بازو تھے جس صفاکی سے تہ تیغ کیا، بصرہ کے محدثین اور علماء کا خون جس طرح بے دریغ بہایا، اس کو دیکھ دیکھ کر اور سُن سُن کر تمام مجمعِ اسلامی دم بخود تھا۔

بنوامیہ کے دور میں مذہبی فرقوں کا ظہور تلوار کا جادو زبان کو گونگا کر سکتا تھا، لیکن دل کا کانٹا نہیں نکال سکتا تھا. اس کیلئے مذہبی منتر

کی ضرورت تھی، آخر وہ منتر بنواُمیہ کو مِل گیا۔ اور وہ "مسئلہ جبر" تھا، یعنی یہ کہ انسان مجبورِ محض ہے، جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے، اس لیے انسان اپنے اعمال کا ذمّہ دار نہیں، اس کی ذمّہ داری خدا پر عائد ہے، ان وجوہ سے ان سفاکیوں کے وہ مجرم نہیں بلکہ نعوذ باللہ خود خدا ذمّہ دار ٹھہرے[۱]، عراق کے اہلِ فکر نے اہلِ شام کے اس جواب کا جواب "نظریۂ قدر" سے دیا، یعنی یہ کہ انسان اپنے تمام اعمال کا آپ ذمّہ دار ہے، "تقدیر کوئی شے نہیں[۲]۔ خدا نے اس کے افعال پر اس کو قدرت دے رکھی ہے انسان خود جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے، یہ آواز سب سے پہلے عراق سے اُٹھی، اور سنسویہ یا سوسن نام ایک عجمی فراد کی زبان سے بلند[۳] ہوئی مَعبدُ جُہنی نے اس کو اصولِ عقائد میں داخل کر دیا، کچھ لوگ بصرہ سے حضرت ابن عمرؓ کے پاس آئے اور عرض کی کہ "ہمارے ہاں کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں جو تقدیر کے منکر ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمام کام پہلے سے مقدّر ہو کر نہیں بلکہ از سرِ نو ہوتے ہیں" حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ "ان سے کہہ دو کہ ہم کو ان سے تعلق نہیں، اور ان کو ہم سے نہیں[۴]"، معبد جُہنی نے مسئلہ قدر کو بصرہ کے علمی حلقوں تک پہنچایا، اور پھر رفتہ رفتہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

---

[۱] مقریزی جلد ۲ صفحہ ۳۵۶، مصر۔ [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب ماجاء فی القدریہ

[۳] کتاب الصفات بیہقی و خلق افعال العباد بخاری ص ۵۲، طبع دہلی [۴] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

معبد اور عطاء بن یسار، حضرت حسن بصری کی خدمت میں آتے اور عرض کرتے کہ "یہ لوگ (بنواُمیّہ) خلق خدا کا خون بہاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ خدا کے حکم سے کرتے ہیں،، انہوں نے کہا" خدا کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں" آخر مَعبد نے بغاوت کی اور عبدالملک اموی کے حکم سے قتل ہوا، معبد کے بعد عمرو ابن عبید، جعد بن درہم اور غیلان دمشقی وغیرہ نے اس آواز کو دبنے نہ دیا، اور یہ سب یکے بعد دیگرے بنوامیّہ کے ہاتھ سے قتل ہوئے، ان کے قتل نے اس فرقہ میں اور زیادہ جوش برپا کر دیا، اور ایک دوسرا اصول ان میں مسلّم ہوا، کہ سفاکوں اور ظالموں کو ٹوکنا، اور عدل وانصاف کی دعوت دینا فرض ہے، ابتداءً اس فرقہ کا نام **قدریہ** پڑا، اور آخر بڑھتے بڑھتے یہی معتزلہ بن گیا۔

فرقوں کا انتشار اب وہ وقت آگیا کہ امویہ کا دور گذر کر **عباسیہ** کا ستارۂ اقبال خراسان کی سرزمین سے طلوع ہوا، یونان وعجم کے فلسفہ نے زبانوں کی گرہیں کھول دیں جس کے مُنہ سے جو بات نکلی وہ ایک مذہب بن گئی، عراق، خراساں رَے وغیرہ ایران کے بڑے بڑے شہر مذہب سازیوں اور فرقہ بندیوں کے مرکز بن گئے خراسان میں جہم بن صفوان ترمذی پیدا ہوا۔ جس نے تمام صفات الٰہیہ کا اِنکار کیا، اور خدا کو مجبور محض فرض کیا، معتزلہ نے خدا کو صفات سے اس قدر منزّہ کیا

کہ وہ معدوم کے ہم معنی بن گیا۔ ابن کرام سیستانی نے رَے میں خدا کی تجسیم کا وہ اعتقاد ظاہر کیا کہ ایک خوبصورت اور نقرہ صورت انسان بنا کر تخت پر بٹھا دیا، معتقدینِ تجسیم بھی ایک خیال پر متفق نہ ہوئے **خراسان** میں سلیمان مفسر نے یہ اعتقاد ظاہر کیا کہ خدا کا جسم گوشت اور پوست سے مرکّب ہے۔ ہشام بن حکم نے گوشت پوست کے بجائے اس کو نورانی الجسم کہا، ہشام بن سالم جوالقی نے کہا خدا نور ہے، گوشت پوست نہیں، اوپر کا دھڑ مجوّف اور نیچے کا دھڑ ٹھوس ہے، اس کے کالے کالے بال ہیں، انسانوں کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے، اُس کے ہاتھ ہے پاؤں ہے، منہ ہے، ناک ہے، ڈاڑھی نہیں، میاں بن سمنان نے کہا خدا کے جسم تو ہے، لیکن وہ قیامت میں فنا ہو جائے گا صرف چہرہ رہ جائے گا، معتزلہ نے خدا کی رویت کا انکار کیا، دوسروں نے کہا رویت ان حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ایک اور حاسّہ سے ہو گی، جو قیامت میں خدا پیدا کرے گا۔

یہ بحث تو صرف خدا کی ترکیب کے لحاظ سے تھی، خدا کے صفات کی بحث اس کے بعد شروع ہوتی ہے **جہمیہ** نے خدا کے صفات الٰہیہ سے انکار کیا کہ اگر صفات ہوں تو ان کی بقا بھی لازم آتی ہے، اور دائمی بقا صرف خدا کی ذات کو ہے۔ نیز اگر صفات الگ ہوں تو ذات و صفات سے مِل کر خدا کی ترکیب لازم آتی ہے، اور وہ ترکیب سے

پاک ہے، معتزلہ نے کہا خدا کی عین بسیط ذات ہی صفات کی قائم مقام ہے، اس کے مقابل **ظواہر** نے کہا صفات، ذات سے الگ مستقل ہستی رکھتی ہیں، **اشاعرہ** نے کہا کہ صفات نہ عین ذات ہیں نہ خارج از ذات ہیں **کعبی** بلخی نے کہا کہ خدا میں صرف ایک صفت علم ہے اور ارادہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔

ایمان اور عمل ایک شے ہے، یا عمل، ایمان سے خارج ہے، ایمان زبان سے صرف اقرار کا نام ہے، یا دل سے محض اعتقاد کا، یا زبان کے اقرار اور دل کے اعتقاد دونوں کے مجموعہ کا، ایمان میں کمی زیادتی ہوسکتی ہے یا نہیں، خدا پر ایمان لانا عقلاً واجب ہے یا سمعاً، نبوّت کا ثبوت عقل سے ہوتا ہے یا نقل سے، معجزہ ممکن ہے، معجزہ دلیلِ نبوّت ہے یا نہیں، معجزہ مخفی اسباب پر مبنی ہوتا ہے یا محض خدا کے حکم سے ہوتا ہے، خدا کے احکام میں مصالح اور حِکَم ہوتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی مشیّتِ محض سے وہ احکام صادر ہوتے ہیں، خدا کے کام اسباب کے زیرِ اثر ہیں یا نہیں، قرآن کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ قرآن کا جواب درحقیقت نہیں ہوسکتا تھا، یا ہوسکتا تھا لیکن خدا نے انسان سے اس کی قدرت سلب کر لی ہے، قرآن میں وجہِ اعجاز کیا ہے؟ اس میں پیشینگوئیوں کا ہونا یا اس کی عبارت کی فصاحت و بلاغت، قرآن کلامِ الٰہی کیونکر ہے، وہ قدیم ہے یا حادث،

اس کے الفاظ بھی قدیم ہیں یا صرف معانی، جنّت اور دوزخ اس وقت موجود ہیں یا قیامت میں ان کا وجود ہوگا، دوزخ کو بھی بہشت کی طرح دوام ہوگا یا قیامت کے بعد اس پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اس پر فنا طاری ہو جائے گی، اور اسی طرح بہشت ہمیشہ قائم رہے گی، یا ایک زمانہ کے بعد اس پر فنا طاری ہو جائے گی۔ قبر میں بندہ پر عذاب ہوتا ہے یا نہیں، دوزخ میں کفّار سب ایک بار جلیں گے، یا بار بار، خدا کو محال پر قدرت ہے یا نہیں، وہ ظلم کرسکتا ہے یا نہیں؟

امامت کا سلسلہ ہم نے چھیڑا نہیں، کہ اس سے پھر ایک اور تسلسل پیدا ہوگا۔

یہ اور ان کے علاوہ سینکڑوں مسائل مختلف فرقوں کے عقائد کی صورت میں پیدا ہوئے، اور جس کی عقل نے جو بات کہی وہ ایک گروہ کا مذہب قرار پا گئی، چنانچہ یہ تمام مسائل مختلف فرقوں میں نفیاً یا اثباتاً اصولِ مذہب میں داخل ہیں، اور مِلل ونحل کی کتابوں میں ان کی تفصیلات درج ہیں، یہ اختلافات صرف زبان اور دلائل تک محدود نہ رہے، بلکہ بارہا دست وگریبان تک نوبت پہنچی تیسری صدی میں **اشعریت** پیدا ہوئی، جس نے محدثین اور فقہاء میں بھی حسنِ قبول پیدا کیا، کہ اس کا مسلک عقل ونقل اور معتزلہ اور ظواہر کے

بیچ بیچ میں تھا، اس نے ایک طرف باقلانیؒ ابن فورک، غزالی اور رازی کے زورِ بیان سے، اور دوسری طرف ملک شاہ سلجوقی، سلطان محمود غزنوی، سلطان صلاح الدّین ایوبی، اور محمد بن تومرت موحدی (اسپین) کی تلواروں سے وہ قوت حاصل کی کہ تمام فرقے اس کے سامنے دب گئے، تاہم بغداد کی سرزمین جب تک شاداب رہی، حنابلہ اور اشاعرہ کے جن میں سے ہر ایک کتاب و سنت پر عمل و ایمان کے دعویدار تھے، کبھی باہمی فتنوں سے خالی نہ رہی۔

ضلالت کے طبعی اسباب ! اسلام کے مختلف فرقوں کی پوری روداد آپ کے سامنے ہے، غور سے پڑھیئے، اور دیکھئے کہ ان اختلافات کا اصلی مبنیٰ، اور اُن کی پیدائش کے اصلی اسباب کیا تھے؟ یہ تھے کہ اسلام کی عملی زندگی کو چھوڑ کر صرف تخیّل کی زندگی اُن پر چھا گئی تھی۔

خیال آرائی ! اسلام میں اختلافات کی جو بنیاد پڑی، جب تک ان میں عجمی عنصر غالب نہ ہوا وہ عمل اور زندگی کی جنگ تھی، وہ مذہب کی آمیزش کے بغیر خالص سیاسی اور پولیٹیکل جنگ رہی، جس کے فیصلے کئی بار تلوار سے چاہے گئے، عجمیت کے عنصر نے پالیٹکس کو مذہب کے پردے میں چھپا دیا، اور تلوار کی جگہ شکوک و شبہات، استدلالاتِ عام فریب، تاویلِ فاسد اور تغیّرِ عقائد نے لے لی، نتیجہ یہ ہوا کہ تلوار کی جنگ

گو مادی اجسام کو فنا کر رہی تھی لیکن قومی زندگی کی رُوح کو نہیں فنا کر رہی تھی، قوم میں زندہ رہنے کا جوش و خروش تھا، لیکن خیال آرائی کے اس طرزِ جنگ نے زندگی کے اصل جوہر، مذہب کی اصل رُوح، اور عمل کی اصلی قوت کو فنا کر دیا۔

عقائد میں وسعت طلبی ! اسلام کے اصل عقائد نہایت سادہ، اور مختصر ہیں، کوئی اُنکو سمیٹنا چاہے تو صرف ایک لا الٰہ الا اللہ میں سمیٹ سکتا ہے۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ مَنْ قَالَ لا اِلٰہ الا اللہ دَخَلَ الجَنّۃَ، جس نے لا الٰہ اِلّا اللہ کہا وہ جنّت میں داخل ہوا، اور اگر کچھ پھیلائے تو وہ سارے قرآن کو محیط ہے، اسلام نے اصولِ دین کو چھ دفعات میں یک جا کر دیا ہے۔ اور وہ وہی ہے جو سورۂ بقرہ کے اوّل و آخر میں ہے، اور ایک حدیث میں ان کو بیان کیا گیا، ایمان باللہ، ایمان بالرّسل، ایمان بالکتاب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالیوم الآخر اور ایمان بالتقدیر، یہ دفعات صحابہ کے عہد میں بالکل سادہ تھے، مگر جیسے جیسے مسلمانوں میں خیال آرائی بڑھتی گئی ان مسائل میں نئے نئے مباحث بڑھتے گئے۔

اسلام عقائد کی وسعت اور کثرت کا شائق نہیں، بلکہ اسکے رسوخ، استواری اور شدتِ اذعان کا طالب ہے، لیکن انسانیت کی بیمار فطرت ہمیشہ وسعت کی طرف جاتی ہے، خلاقِ فطرت کا فرستادہ اس رمز سے آگاہ تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ آپنے فرمایا

لن یبرح النّاس یتسَاءلون حتیٰ	لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے بحث و مناظرہ کرتے
یقولوا ھذا اللہ خالق کلِ شئیٍ	ہوتے یہاں تک پہنچیں کہ اچھا خدا نے سب
فمن خلقَ اللہ ؟	چیزوں کو پیدا کیا، پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟

تاویل متشابہات

مسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ نے آیت ذیل تلاوت فرمائی ۔

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ اٰیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَ اُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ ،

اس نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ، جسمیں کچھ آیتیں محکم اور واضح ہیں ، وہ اصل کتاب ہے اور بعض متشابہ ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں ، فتنہ اٹھانے اور اسکے مطلب کو حل کرنے کیلئے حالانکہ اس کا حقیقی مطلب خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ، اور جو لوگ علم میں پکے ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور عقلمندوں کے سوا کوئی عبرت نہیں پکڑتا ۔

پھر فرمایا :

اِذَا رَاَیْتُمُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ

جب ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں تو جانو کہ یہ

سَمَّی اللّٰہُ فَاحْذَرُوْھُمْ ،   وہی ہیں جنکا خدا نے نام لیا ہے
توان سے احتراز کرو ۔

اسی بناء پر صحابہ کرامؓ سے اگر کبھی کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو اس ارشاد کے خلاف ہوتا تو آپ سخت برہم ہوتے، **ترمذی** میں حضرت ابوہریرہؓ سے اور **ابن ماجہ** میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ کچھ اصحاب ایک حلقۂ مجلس میں بیٹھے بحث ونزاع میں مشغول ہیں، فرمایا کہ کس مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہو؟ عرض کی مسئلہ تقدیر میں، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، راوی کا بیان ہے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے چہرۂ مبارک پر انار کے دانے نچوڑ دیئے ہیں، آپ نے فرمایا" کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے، کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو، کیا میں یہی پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں؟ قرآن کی ایک آیت کو دوسری پر پٹکتے ہو. تم سے پہلے جو قومیں تھیں وہ اسی میں ہلاک ہوئیں، میں بتاکید کہتا ہوں کہ اس میں جھگڑا نہ کرو۔"

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام عقائد کی وسعت اور ان میں بحث ونزاع کا شائق نہیں، وہ صرف اس پیغام پر ایمان ویقین کا طالب ہے جو علی الاعلان وہ تمام دنیا کو سناتا ہے جس کے سمجھنے میں نہ عرب کے بدووں اور افریقہ کے حبشیوں کو

تامل ہے اور نہ یونان کے حکیموں اور یورپ کے فلاسفروں کو، **بخاری** میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صاحب کو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا تھا، وہ احمق سی کوئی حبشیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہے؟ آپ نے اس سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا دی، آپ نے ان صاحب سے فرمایا، لیجاؤ یہ مسلمان ہے،

اللہ اکبر، اسلام کی حقیقت پر کتنے پردے پڑ گئے ہیں، آپ اسلام کے لئے صرف آسمان کی طرف اُنگلی اٹھا دینا کافی سمجھتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک آج کوئی مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک **نسفی** کے تمام بندھے ہوئے عقائد پر حرفاً حرفاً آمنتُ نہ کہتا جائے۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

پہلی دو نشستوں میں ہم یہ اچھی طرح واضح کر چکے ہیں کہ مذہب کی اصلی اور حقیقی تصویر وہی ہے جو داعیٔ مذہب کے علم وعمل اور اس کی تعلیم وتلقین کا صحیح اور ہُو بہو عکس ہو، پیغمبر کی ضرورت ہم نے اسی لئے تسلیم کی ہے کہ عقلِ انسانی زندگی کی اصلی گرہوں کے کھولنے سے عاجز ہے۔ اس لئے رحمتِ الٰہی انسانیت کے ایک بلند ترین پیکر کو روح القدس کے توسط سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے بھیجتی رہی

وہ لوگوں کو ہر قسم کے تلقینات سے مشرف کرتا ہے۔ اُن کو اُن کی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے تعلیمات دیتا ہے، لیکن ما فوق الفہم اسرار کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں، اور اس کی عملی زندگی کے لئے اُن کا علم ضروری نہیں، ان کو وہ اسی طرح سربستہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، اور ان کے متعلق وہ صرف یہ سکھاتا ہے،

وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا.	اسکی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جو علم میں راسخ اور پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔

اس بناء پر اگر ہم ان اعتقادات اور تعلیمات پر جو پیغمبر نے انسانوں کے لئے ضروری سمجھے۔ اپنی عقل اور سمجھ سے کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہیں، یا کچھ اس میں سے حذف کرنا یا بڑھانا چاہتے ہیں، یا جس گرہ کو جہاں تک اس نے کھول کر چھوڑ دیا ہے ہم اس کو اور کھولنا چاہتے ہیں، تو درحقیقت ہم اصل نبوّت کے ثبوت کے دعویٰ کو کمزور کر رہے ہیں اور عملاً ہم بتانا چاہتے ہیں کہ انسانیت کی تکمیل کے لئے پیغمبر کی حاجت نہیں بلکہ خود عقلِ انسانی ہماری رہبری کے لئے کافی ہے، حالانکہ اس کا بطلان ہمارے نزدیک بدیہی الثبوت ہو چکا ہے۔

غور کیجئے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کی عملی زندگی کے لئے وہ چراغِ راہ ہے، انسان اور اس کی عملی زندگی کا تعلق تمام تر مادّیات سے ہے، اس لئے ماورائے مادّہ کی نسبت صرف وہیں تک اس کو تعلق ہے جہاں تک انسان کی عملی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ ہم اپنے مقصود کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے ذرا تفصیل سے کام لیتے ہیں۔

مذہب میں دو چیزیں ہوتی ہیں، عقائد اور اعمال، دوسرے الفاظ میں ان کی تعبیر ہو سکتی ہے کہ مذہب علم اور عمل سے مرکّب ہے۔

علم کی ۲ دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مادیات سے ماخوذ اور انھیں سے وابستہ ہے اور اس کے متعلق ہم میں بذریعہ مشاہدہ اور تجربہ کے یقین پیدا ہوتا ہے، دوسرا وہ علم ہے جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے اور جس کے جاننے کا ذریعہ صرف تخیّل، تصوّر اور ظن ہے، "آگ جلاتی ہے" یہ علم مادی ذریعۂ احساس سے ہم کو حاصل ہوا ہے، اس لئے ہم کو اس درجہ یقین ہے کہ غلطی سے بھی ہم آگ میں کودنے کی ہمّت نہیں کر سکتے۔ لیکن دوسرا علم یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد پھر دوسرا جنم لیتا ہے۔ لیکن اس علم پر اعتماد کر کے کیا کوئی انسان اپنی زندگی کا آپ خاتمہ کر دینے پر تیار ہو گا؟

ہماری زندگی اسی عالمِ مادّی سے تعلق رکھتی ہے، ہمارے اعمال

اسی عالم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افرادِ انسانی کی کامیابی اور ناکامی قومیں اور قوموں کی ترقی و تنزل، عروج و زوال، انقلاب و تغیر غرض انسانیت کے جملہ مظاہر اور عالم کے تمام تر نظامِ ترقی انھیں یقینیات اور علوم قطعیہ پر مبنی ہیں، جن کا ماخذ ہمارے حواس ہیں، اس بناء پر ان علوم و مسائل اور معلومات کے پیچھے پڑنا اور ان کی گرہ کشائی چاہنا، جو ماورائے حواس ہیں، اور جن کے ساتھ ہمارا علم متعلق نہیں ہو سکتا، ہمارے لئے بالکل بے سود اور غیر مفید ہے۔

ہمارا فلسفہ جس کا تعلق ماورائے مادّہ سے ہے "علم ظنی" ہے سائنس کا اکثر حصّہ ہمارے گذشتہ تجربوں اور مشاہدوں کی بناء پر ایک حد تک درجۂ یقینی رکھتا ہے، اب دیکھ لیجئے کہ دنیا ان دونوں میں سے کس کی ممنون ہے؟ فلسفہ کی یا سائنس کی؟

یونان کے سب سے پہلے فلسفی **تالیس** سے لے کر **بیکن** کے عہد تک ڈھائی ہزار برس میں فلسفہ دنیا کے لئے کیا کارآمد ہوا، لیکن سائنس نے دو تین سو برس کے اندر اندر عالم میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، اس بناء پر غیر مادی اور غیر محسوس اشیاء کی نسبت یہ سوال کہ وہ کیا ہیں؟ اور کیونکر ہیں؟ بالکل بے سود ہے، اور اس کی دلیل، اس سوال کے حل میں انسانی نسلوں کی گذشتہ صدیوں اور قرنوں کی ناکامی ہے، اس لئے ہماری بحث اور تحقیقات

کا موضوع نفیاً یا اثباتاً، غیر محسوس اشیاء نہیں ہو سکتیں،

یہی وہ نکتہ ہے جس کو یورپ نے اب سمجھا ہے، اور جس کو اسلام نے اپنے آغازِ ظہور میں ہی وانشگاف کر دیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اہل السنۃ کے سوا اسلام کے اور فرقوں نے اس کو محفوظ نہیں رکھا، اور یہی آخر ان کی بے راہ روی کا سبب ہوا، اور اس کا بڑا نقصان یہ پہنچا کہ ہماری خیالی دنیا وسیع ہو گئی مگر عملی دنیا تنگ ہو گئی منطق و فلسفہ کی خیالی و قیاسی بحثوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر تجربی، مادی علوم سے جن کا مدار اشیاء کے خواص وصفات کی معرفت پر ہے ہم بے خبر ہو گئے، اور دشمن ہم سے بازی لے گیا اور عملی و مادی دنیا کی ہر چیز میں ان کے محتاج ہو گئے، یہ عملی نقصان تو عملی اقتصادی حیثیت سے پہنچا، اور دین کی حیثیت سے یہ نقصان پہنچا کہ عقائد کی ان عقلی پیچیدگیوں میں اُلجھ کر اخلاق و عمل میں ہم سست و ناکارہ رہ گئے اور دین و دنیا ہر حیثیت سے ہمارے عملی قویٰ کمزور اور سست ہوتے چلے گئے۔ اس تفصیل سے یہ ظاہر ہو گا کہ **اہلِ سُنّت** کے مذہب کا مدار اور مبنیٰ یہ دو اصول ہیں،

(۱) داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عقائد اور اعمال کے متعلق اپنی اُمّت کو جو کچھ تعلیم اور تلقین کی، اس پر استوار رہا جائے یہی صراطِ مستقیم ہے۔

(۲) عقائد یا خدا کی ذات اور صفات کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا یا آپ نے جو کچھ بتایا، اور جس مسئلہ کی حد تک قرآن نے تشریح کی، صرف اسی پر ایمان لانا واجب ہے، صرف اپنی عقل و قیاس و استنباط سے ’نصوص کی روشنی کے بغیر‘ اس کی تشریح و تفسیر صحیح نہیں، اور نہ اس پر ایمان لانا اسلام کی صحت کے لئے ضروری ہے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ گمراہی اور ضلالت کا موجب ہو،

اسلام کے تمام فرقے اگر ان دو اصولوں پر قائم رہتے تو یقیناً عقائد کے وہ عظیم الشان اختلافات رونما نہ ہوتے، جس کے سیلاب نے ایک مدتِ مدید سے کاشانۂ اسلام کے ارکان متزلزل کر رکھے ہیں، خوب غور کیجئے، گذشتہ مباحث میں ہم نے مختلف فرقوں کے جو مسائل اور معتقدات گنائے ہیں ان کی گم راہی کا سبب صرف یہی ہے کہ انہوں نے ان امور کی تفصیل چاہی جن سے قرآن خاموش تھا اور جن کی تشریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری نہیں سمجھی، کہ اوّل تو وہ اُن سربستہ اسرار اور مشکل عقیدوں میں سے ہیں، جن کا حل عقل انسانی کے فہم و ادراک سے باہر ہے اور ثانیاً یہ کہ انسان کی عملی زندگی کے لئے ان کا علم بے سود ہے۔

شریعت نے خدا کے متعلق یہ بتایا ہے کہ وہ ایک ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ تمام اعلیٰ صفتوں سے متصف ہے، اور

ہر عیب سے پاک ہے، اس کے بعد یہ بحث کہ وہ ایک کس حیثیت سے ہے، صفات کی مختلف قسمیں ہیں۔ کون سی صفتیں اس میں پائی جاتی ہیں؟ یہ صفات اس کی ذات میں داخل ہیں یا اس کی ذات سے الگ ہیں اگر الگ ہیں تو قدیم ہیں یا حادث، اگر قدیم ہیں تو تعدّدِ قدما لازم آتا ہے حالانکہ قدیم صرف ایک ہی ہے، اگر حادث ہو تو خدا محل حادث ہوگا اور محل حادث خود حادث ہوتا ہے، اگر الگ نہیں بلکہ ذات میں داخل ہیں تو ذات کا جزُ ہوکر یا کُل ہوکر، اگر ذات کا جزُ ہے تو خدا کی ترکیب لازم آتی ہے اور اگر کل ہے تو عین ذات ہوگی، اس لحاظ سے اس کی ذات اور صفات میں سے ایک کی نفی لازم آئے گی اور علم، قدرت، سمع، بصر، ارادہ وغیرہ مختلف صفات مختلف نہیں بلکہ متحد ہو جائیں گی۔

خدا کی نسبت ہاتھ پاؤں، منھ اور قدم کے الفاظ کتاب وسنّت میں آئے ہیں۔ ان سے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی، خدا کی نسبت قرآن میں ہے کہ " وہ عرش پر مستوی[1] ہوا"۔ اور یہ بھی ہے کہ "جدھر[2] رخ کرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے"۔ یہ بھی ہے کہ " وہ تمہاری رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب[3] ہے" تو آیا وہ کسی خاص جگہ میں ہے، یا جگہ سے مُبرّا ہے

---

[1] اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس کا ترجمہ کیا "وہ عرش پر جا براجا"۔ [2] اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ [3] نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ،

پہلی صورت میں اس کا جسم ہونا لازم آتا ہے، اور دوسری صورت میں کسی خارجی موجود کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہر جگہ موجود ہے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

احادیث صحیحہ میں ہے کہ قیامت میں خدا بہشت میں بہشتیوں کو نظر آئے گا اب اس پر یہ بحث کہ اگر یہ تسلیم کر لیں گے تو لازم آئے گا کہ وہ جسم ہو، کسی خاص جگہ میں ہو، اور اگر نظر آنا تسلیم کریں تو انھیں آنکھوں سے وہ رویت ہوگی، یا کسی اور جدید حاسہ سے، ان آنکھوں سے نظر آنا، خدا کے لئے جسم، رنگ، تحدید، تعیین وغیرہ کو مستلزم اور آخری صورت میں موجودہ ذرائع احساس کے علاوہ کسی اور ذریعۂ احساس کا اعتقاد فہم سے بالاتر ہے۔

شریعت میں اس قدر ہے کہ خدا نے عالم کو پیدا کیا اور وہ اس کا مخلوق ہے، اس کے بعد یہ مباحث کہ خداوند تعالیٰ اس کی علتِ کامل ہے یا ناقص، اگر علت ناقص یعنی غیر تامہ ہے تو عالم کی خالقیت کے لئے کسی اور شے کی شرکت بھی لازم آتی ہے اور اگر علتِ کامل یعنی تامہ ہے تو علتِ تامہ اور معلول کا وجود ساتھ ساتھ ہوتا ہے اس بناء پر عالم کو بھی قدیم ہونا چاہیئے،

قرآن نے بتایا ہے کہ بندوں کے تمام افعال خدا کے حکم سے ہوتے ہیں، اس کے بعد یہ سوالات کہ اس کا حکم ہی فعل کے وجود کا سبب

ہوتا ہے یا بندہ کے عمل کو بھی دخل ہوتا ہے، اگر دخل نہیں تو بندہ کو مجبور محض کہنا ہوگا۔ اگر دخل ہے تو یہ دخل موثر ہے یا غیر موثر، اگر موثر ہے تو درحقیقت وہ اپنے فعل کا آپ خالق ہوا، اور اگر غیر موثر ہے تو دوسرے معنی میں جبر ہے،

یہ تمام مذکورہ بالا مسائل اور ان کی جو تشقیقیں کی گئی ہیں وہ نفیاً یا اثباتاً” کسی نہ کسی فرقہ کا معتقد علیہ اور مسلک ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ عقلی توہم پرستی کے اعتراضات سے ان میں سے کوئی شِق بھی بَری نہیں، یہ اعتراضات یا لوازم مستحیلہ، یا عقلی سرگردانیاں کیوں پیدا ہوئیں، اس لئے کہ ہم قرآن کی "تلقینات پر قناعت نہیں کرتے، اور ان امور کی تشریح چاہتے ہیں، جن کی تشریح سے عقلِ انسانی عاجز ہے، اور ہماری عملی زندگی کے لئے وہ غیر ضروری ہیں۔

اگر ہم اپنے معتقدات کے احاطہ کو اس دائرہ کے اندر کرلیں جس کو وحی الٰہی کے پرکار نے سطح اسلام پر کھینچا ہے، تو یہ حصار ہمارے لئے یقیناً” قلعۂ روئیں کا کام دے گا، اور ہم ان بہت سے خدشوں اور حملوں سے محفوظ ہوجائیں گے، جو قرآن کی تصریحات کے سبب نہیں، بلکہ خود ہمارے عقلی تفصیلات کے باعث ہم پر عائد ہوتے ہیں، اور غلطی سے ہم ان کا مستوجب اپنے مذہب کو قرار دیتے ہیں، بہت سے فِرقِ اسلامیہ سے بڑی مسامحت یہ ہوئی

کہ عقل اور فلسفہ نے جس امر کے متعلق بھی کوئی جواب چاہا انھوں نے اپنے ناخنِ تدبیر سے اس کو حل کیا، اور نفیاً یا اثباتاً اس کو داخلِ مذہب کرلیا، یہاں تک کہ خالص فلسفیانہ مسائل جن کو مذہب سے ایک ذرہ تعلق نہیں، مثلاً جُزءُ الّذی لَایَتَجَزّیٰ کی بحث۔ طُفرہ کا مسئلہ، رویت کے اسباب، استطاعت مع الفعل کی بحث وغیرہ اس کو بھی انھوں نے عقائد کی کتابوں میں داخل کرلیا ہے اگر آج ہمارے عقائد کی کتابوں کی چھان بین کی جائے تو نصف سے زیادہ اوراق انھیں مباحث سے بھرے ملیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ متکلمین نے عقائد صحیحہ پر جو شکوک وشبہات مدعیانِ عقل کی طرف سے عائد ہوئے ان کے جواب کی خاطر ان مسائل میں بحث کی، اور بعض پہلوؤں کی تصریح پر وہ مجبور ہوئے اور اس طرح علم کلام کا یہ سارا دفتر وجود میں آیا، اور اس لئے بھی یہ بحثیں کیں کہ فِرقِ ضالّہ کے آرائے باطلہ سے مسلمانوں کو بچائیں، اور یہ کوششیں ان کی مشکور ہوئیں، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے سیدھے سادے عقائد میں الجھنیں بھی پیدا ہوگئیں۔

الغرض اہل السنۃ نے جو صراطِ مستقیم اختیار کیا وہی درحقیقت اس طوفانِ افکار اور طغیانِ خیالات کی حالت میں سفینۂ نوح ہوسکتا تھا، لیکن دو تین سو برس کے بعد تیسری چوتھی صدی میں

جب مسلمانوں میں فلسفہ نے عروج حاصل کر لیا، اور ممالک اسلامیہ کے در و دیوار سے اس آواز کی بازگشت آنے لگی، تو خود اہل السنتہ میں سے چند افراد اٹھے، اور قدیم شاہراہ کو چھوڑ کر انھوں نے اہل السنتہ اور دیگر فرقوں کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کیا، اور عقل و نقل اور فلسفہ و سنّت کے درمیان ایک متذبذب صورت کو اپنا مسلک قرار دیا، انھوں نے یہ سمجھا کہ اس طریقہ سے وہ عقل و نقل اور فلسفہ و شریعت کی تطبیق میں نہ تو معتزلہ کی طرح قرآن و سنّت سے دور پڑ جائیں گے، اور نہ ارباب ظواہر کی طرح اہل فلسفہ کے نشانۂ اعتراضات بنیں گے۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے یہ مسائل نہ تو اصل قرآن و سنت کے مطابق رہے اور نہ عقل و فلسفہ کے دربار ہی میں وہ رسوخ پا سکے۔

مثلاً ایک طرف تو انھوں نے معتزلہ کے ساتھ ہو کر خدا کے لئے اعضاء کے اطلاق سے انکار کیا، اور ان آیتوں میں جن میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور منہ کا ذکر ہے تاویل کی، اور دوسری طرف ظاہریہ کے ساتھ خدا کی رویت کا اقرار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ اہل السنتہ کا ساتھ دے سکے، اور نہ اہل فلسفہ کی معیت برقرار رہ سکی، ان کو بدیہیات کا انکار کرنا پڑا کہ رویت کے لئے مرئی کا جسم ہونا، متحیّز ہونا ذی لَون ہونا، آنکھ کے سامنے ہونا، اس سے ایک مسافت پر ہونا،

ضروری نہیں، ایک اور مسئلہ میں یعنی مسئلہ جبر و قدر میں انھوں نے اسی قسم کا توسط اختیار کیا، ایک طرف تو یہ کہا کہ تمام افعال کا خالق خدا ہے، یہ کہہ کر گویا اپنے کو معتزلہ اور قدریہ سے الگ کیا، دوسری طرف انسان کے لئے کسب ثابت کیا کہ جبر نہ لازم آئے، لیکن جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا یہ کسب فعل کے وجود میں موثر بھی ہے؟ تو جواب نفی میں دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ **جبریہ** سے قریب ہو گئے، جیسا کہ ہر صاحب نظر کو تفسیر کبیر میں امام رازی کا انداز نظر آتا ہے۔

جس طرح اسلام میں بہت سے ایسے فرقے ہیں جو درحقیقت دائرہ اسلام میں داخل نہیں، اسی طرح بہت سے ایسے فرقے بھی ہیں جو خود کو اہل السنتہ کہتے ہیں لیکن حقیقتہً وہ ان میں سے نہیں ہیں، سبب یہ ہے کہ قدمائے اہل السنتہ نے جو اصول قرار دیئے تھے، دیگر عقل پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر متاخرین نے ان میں تبدیلی کر دی، اور با ایں ہمہ وہ اپنے کو اہل السنتہ سمجھتے ہیں، بلکہ لفظ اہل السنتہ کا صحیح مخاطب صرف اپنے کو ہی جانتے ہیں۔

تیسری چوتھی صدی سے اہل السنتہ تین عظیم الشان شاخوں میں منقسم ہیں۔

اشاعرہ، حنابلہ اور **ماتریدیہ**: اشاعرہ امام ابوالحسن اشعری کی طرف منسوب ہیں، اور امام شافعیؒ کے عقائد کے شارح

سمجھے جاتے ہیں، اس لئے تمام شوافع اشعری ہیں، حنابلہ اپنے کو احمد بن حنبلؒ کا پیرو کہتے ہیں، ماتریدیہ امام ابو منصور ماتریدی کے پیرو ہیں، جو بچند واسطہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے، اس لئے احناف نے عقائد میں ان کو اپنا امام مانا، بہرحال ان بزرگوں کے باب میں جو اقوال ملتے ہیں وہ قدمائے اہل السنۃ اور سلف صالح کے مطابق ہیں، لیکن متاخرینِ اہل السنۃ سے بڑی مسامحت یہ ہوئی کہ اُن مسائل کے متعلق جن سے شریعت خاموش تھی، اُن کو حوالۂ علم الٰہی کرنے کے بجائے ان کی نسبت دیگر فرقوں کی طرح ادّعائی پہلو اختیار کیا، اور بہت سے فلسفیانہ مسائل کو جن کو شریعت سے اصلاً تعلق نہ تھا ان کو داخل عقائد کر دیا۔

ان تصریحات سے واضح ہوگا کہ تارکینِ سنت اور متاخرین اہل سنّت جنہوں نے معتزلہ اور دیگر عقل پرست فرقوں سے مرعوب ہو کر قدمائے اہل سنّت کے اصول میں ترمیم کی، اور اپنے مذہب کو قواعد عقلی کے مطابق بنانے کی کوشش کی، نتیجہ کی رُو سے ان دونوں میں بہت ہی کم فرق ہے، اور درحقیقت ان متاخرین کے اقوال کو سلف صالح اور اہل سنّت کے عقائد اور خیالات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو صرف اسی قدر جس قدر وہ کتاب وسنّت سے قریب ہیں۔

جب ایک مسئلہ کے متعلق شریعت نے کچھ نہیں بتایا اور نہ اس کا جاننا اور اس کی اپنی عقل سے تفصیل کرنا مدار ایمان ٹھہرایا، اور نہ کسی حیثیت سے داعئ اسلام نے اپنے مومنین سے اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا، اس کے متعلق آپ کا نفیاً یا اثباتاً کوئی بھی پہلو اختیار کرنا اور اس کو اسلام کا مبنیٰ قرار دینا کیا حقیقت رسی ہے ؟ کیا اس بارہ میں آپ کا فعل دوسرے فرقوں کے فعل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ مستحسن ہوگا ؟ اگر ان گرہوں کے کھولنے کے لئے آپ کی عقل رہبر بن سکتی ہے تو آپ آگے بھی بڑھ سکتے ہیں۔ اور نعوذ باللہ پیغمبروں کی آمد و بعثت سے بھی اپنے کو مستثنی بتا سکتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر تقریباً ایک لاکھ نفوس قدسیہ نے ایمان و اسلام کی بیعت کی، لیکن کیا آپ کو وہ دفعات نامعلوم ہیں جن پر اُن کے ایمان اور اسلام کی بنا تھی، کیا آپ کے پیدا کردہ عقائد کلامی میں سے ایک بھی اُن کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اگر نہیں تو اپنے خود ساختہ اصول کی حیثیت سے نعوذ باللہ آپ اُن کو کیا کہیں گے، اُن کا ایمان صرف یہ تھا جس کو سورۂ بقر کے اوّل و آخر میں بیان کیا گیا ہے،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ	پیغمبر جو کچھ اُس پر اس کے خدا
رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ	کیطرف سے اُترا اس پر ایمان لایا

وَمَلٰئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا
نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ آخر)
یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَا
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ
یُوْقِنُوْنَ ، (بقرہ اوّل)

اور تمام مومنین، ہر ایک خدا پر
ایمان لایا، اسکے تمام فرشتوں پر
اسکی تمام کتابوں پر، اسکے تمام
پیغمبروں پر ہم اسکے پیغمبروں میں
سے کسی میں تفریق نہیں کرتے،
(متقی لوگ) جو کچھ تجھ پر اترا اور
تیرے پہلوں پر اترا. ایمان لاتے
ہیں اور آخرت پر بھی ایمان
رکھتے ہیں.

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں خدا نے بتایا ہے کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے، جب کوئی شخص قرآن پر ایمان لایا تو اس کے اندر جو کچھ ہے اجمالاً یا تفصیلاً ان سب پر ایمان لایا، خدا کے جو صفات اس میں مذکور ہیں. کتبِ الٰہی، ملائکہ اور پیغمبروں کے متعلق اُس میں جو کچھ ہے، قیامت. حشر و نشر، دوزخ و بہشت کی نسبت جو حالات اس میں مذکور ہیں یہ تمام چیزیں اس کے اندر داخل ہوگئیں. چنانچہ قدمائے اہلِ سنّت اور سلف صالح کا اعتقاد یہ تھا کہ اُن میں سے ہر چیز پر ایمان اسی حیثیت سے اور اسی حد تک لانا ضروری ہے جہاں تک قرآن مجید

نے اس کا مطالبہ کیا ہے . یا جہاں تک سنّت صحیح اور متواتر نے ثابت کر دیا ہے ، کیونکہ یہ متفق طور سے ثابت ہے کہ عقائد کا ثبوت صرف قرآن مجید سے ہو سکتا ہے ، اور احادیث میں سے صرف اُن حدیثوں سے جو بذریعہ تواتر مروی ہیں ، ع (شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد)

قدمائے نزدیک اہلِ سنّت کے معنی

کل کی نشست میں ہم نے بتایا تھا کہ قدمائے اہلِ السنتہ کے یہ دو اصول تھے ،

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عقائد و اعمال کے متعلق اپنی اُمّت کو جو کچھ تعلیم و تلقین فرما گئے اس پر ایک ذرہ کا اضافہ یا اس سے ایک ذرہ کی کمی نہیں ہو سکتی .

(۲) خدا کی ذات و صفات و دیگر عقائد کے متعلق قرآن نے جو بیان کیا ہے یا پیغمبر سے بتواتر جو کچھ ثابت ہے ، اور ان کی نسبت اجمالاً یا تفصیلاً جو کچھ اور جس حد تک انھوں نے تفسیر و تشریح کی ہے اُسی پر ایمان لانا واجب ہے ، اپنی عقل و قیاس اور استنباط سے ان کی تفسیر و تشریح کرنی صحیح نہیں ، اور نہ اس پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا جزو ہو سکتا ہے .

یہ دو اصول ایسے ہیں جن کے اثبات کے لئے کسی مزید دلیل کی حاجت نہیں کیونکہ جیسا ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ آثر ایسے

مسائل ہیں جن کی نسبت عقل کا نفیاً یا اثباتاً ہر قسم کا فیصلہ ناقابلِ لحاظ ہے کہ یہ حدود اس کی دسترس سے باہر ہیں، اور اسی لئے ہم کو ایک پیغمبر کی ضرورت ہے، جو ہمارے علم کی دسترس سے باہر کی چیزوں کو ہمارے حق میں جہاں تک مفید و نافع ہو تعلیم دے، اور جب یہ مقدمہ صحیح ہے تو ان مسائل کی خالص عقل کی رو سے تفسیر یا اضافہ یا اسقاط درحقیقت اپنے پہلے دعویٰ کا ابطال ہے،

لیکن اس قیاس کو چھوڑ کر ہم کو قرآن و سنّت سے ان اصولوں کی صحت ثابت کرنی چاہیئے، اس کے لئے ہم اپنے دوستوں کو اپنی پہلی اور دوسری نشست کی تقریریں یاد دلاتے ہیں جن میں قرآن و سنّت سے اس اصول کو ثابت کیا گیا ہے، آج کے جلسہ میں ائمہ سلف اور قدمائے اہل السنّۃ کے اقوال سے دکھانا ہے کہ ان رسمی فرقوں کے پیدا ہونے سے پہلے اہل السنّۃ کے کیا معنی تھے،

امام مالک بن انس اہل السنّۃ کا عقیدہ بتاتے ہیں،

الکلام فی الدین اکرھہ ولایزال	عقائد میں گفتگو کرنا ناپسند کرتا
اھل بلدنا یکرھونہ وینھون عنہ	ہوں، اور ہمیشہ ہمارے شہر
نحو الکلام فی رای جھم والقدر وما	(مدینہ) کے علماء اس کو ناپسند
اشبہ ذالک وَمَا اُحِبُّ الکلام	کرتے رہے ہیں، اور اُس سے

الا فیما تحتہ عملٌ فاما الکلام فی دین اللہ وفی اللہ عزوجل فاسکوت احبُّ الیَّ لانی رأیت اھل بلدنا ینھون عن الکلام فی الدین الا فیما تحتہ عملٌ۔

(جامع بیان العلم ابن عبدالبر)

روکتے رہے ہیں، مثلاً جہم کی رائے اور قدر میں گفتگو کرنا، میں بحث ومباحثہ ان امور میں ناپسند کرتا ہوں جن کے تحت میں کوئی عمل نہ ہو، لیکن خدا کے عقائد اور خود خدا کی ذات میں سکوت میرے نزدیک پسندیدہ ہے کیونکہ ہم نے اپنے شہر کے علماء کو دیکھا ہے کہ عقائد میں گفتگو کرنے سے روکتے تھے اور ان امور میں کرتے تھے جن کو عمل سے تعلق ہو،

امام موصوف نے نہ صرف یہ اپنا اصول بتایا، بلکہ اپنے تمام پیشرؤوں کا طریقہ یہی بتایا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سلف کی زندگی کی اصلی روش، عمل تھا تخیّل نہیں، وہ صرف ان امور میں گفتگو کرتے تھے جن پر عملاً بھی ہم کو کاربند ہونا ہے۔

امام بخاریؒ خلق افعال العباد میں سلف صالحینؒ کا مذہب

لکھتے ہیں ۔

وانهم کرهوا البحث والتنقيب عن الاشياء الغامضة وتجنبوا اهل الكلام والخوض والتنازع الا فيما جاء فيه العلم او بيّنه رسول الله صلى الله عليه وسلم	انہوں نے ان مشکل مسائل میں بحث وگفتگو کرنا ناپسند کیا اور جو لوگ ان میں گفتگو غور اور نزاع کرتے تھے ان سے پرہیز کیا، لیکن جن مسائل میں علم (خدا کی طرف سے) آیا ہے یا آنحضرت صلعم نے اس کو بیان کر دیا ہے، اس میں انھوں نے غور و فکر اور بحث کی،

امام ترمذی ائمۂ سنّت کا اصول بتاتے ہیں ،

والمذهب فی هذا عند اهل العلم من الائمة مثل سفيان الثوری ومالك بن انس وسفيان بن عيينه وابن المبارك ووكيع وغيرهم انهم رووا هذه الاشياء وقالوا نروی هذه الاحاديث	ائمۂ اہل علم جیسے سفیان ثوری مالک بن انس، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک اور وکیع وغیرہ کا اس بارہ میں مذہب یہ تھا کہ انہوں نے ان چیزوں کی روایت کی

ونؤمن بها ولایقال کیف، و هذالذی اختاره اهل الحدیث ان یرووا هذه الاشیاء کما جلوت ویومن بها ولاتفسر ولایتوهم ولایقال کیف و هذا امر اهل العلم الذین اختاروه وذهبوا الیه،

اور کہا ہم ان حدیثوں کی روایت کرتے ہیں، اور ان پر ایمان رکھتے ہیں، اور یہ نہیں کہا جائے کہ یہ کیوں کر ہے، اور اسی مذہب کو اہلحدیث نے اختیار کیا ہے کہ ان باتوں کی روایت کر دیں جس طرح وہ آئی ہیں، اور ان پر ایمان رکھا جائے اور ان کی تفسیر نہ کی جائے اور نہ وہم کیا جائے اہل علم کا یہی مذہب ہے، اور اسی کو پسند کیا ہے،

محدث ابن عبدالبر قدمائے اہل سنّت کا مسلک بتاتے ہیں،

لان اللہ عزوجل لایوصف عند الجماعۃ اهل السنۃ الا بما وصف به نفسه او وصفه به رسوله او اجتمعت الامۃ علیه ولیس کمثله شیئ فیدرک بقیاس

اس لئے کہ خدائے پاک کا وصف جماعت یعنی اہل السنۃ کے نزدیک وہی ہو سکتا ہے جس کو خود خدا نے بیان کیا ہے یا اس کے رسولؐ نے یا تمام

ادبامعان نظر وقد نهينا عن الفكر فی اللہ واُمرنا بالتفکر فی خلقته الدال علیه ،

(جامع بیان العلم ،ص ۱۵۱ ،مصر)

امّت نے اس پر اجماع کرلیا ہے، خدا کی مثل کوئی شے تو ہے نہیں پھر قیاس یا غور وفکر سے وہ کیونکر دریافت کیاجا سکتاہے، ہم کو خدا کی ذات میں فکر کرنے سے منع کیا گیاہے اور اسکی مخلوقات و مصنوعات میں غور وفکر کا حکم دیا گیاہے جو خدا کے وجود اور ہستی پر دال ھیں

امام بیہقی علمائے سنّت کا منفق علیہ اصول بتاتے ہیں،

فاما الاستواء فالمتقدمون من اصحابنا رضی اللہ عنهم کانوا لایفسرونه ولایتکلمون فیه کنحو مذهبهم فی امثال ذالك

(کتاب الاسماء والصفات)

لیکن عرش پر برابر ہونا، تو قدمائے اہل سنّت اسکی تفسیر نہیں کرتے تھے، اور نہ اس میں بحث کرتے تھے. جیساکہ ان کا مذہب اس قسم کے اور مسائل میں بھی ہے،

دار قطنی میں نہشل[1] خراسانی کی روایت سے ایک حدیث

---

[1] آخر کتاب الاشربہ، نہشل گو ضعیف راوی ہے اسلئے ممکن ہے کہ یہ حدیث آنحضرت تک صحیح نہ ہو لیکن کم از کم اس سے اسکے زمانہ کا حال معلوم ہوتا ہے، وہ تبع تابعین کے زمانہ میں تھا.

ہے کہ مکہ معظمہ کی مسجد خیف میں ضحاک بن مزاحم، حسن بن ابی الحسن طاؤس یمنی، مکحول شامی عمرو بن دینار مکی جو اپنے خطہ کے امام اور مشہور محدث اور تابعی تھے جمع ہوئے اور قدر میں گفتگوئیں شروع ہوئیں، طاؤس جو سب میں مقبول تھے بولے، ذرا آپ لوگ چپ رہئے تو میں حضرت ابو درداءؓ کی حدیث آپ کو سناؤں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے،

ان اللہ افترض علیکم فرائض فلا تضیعوھا، وحدّ لکم حدودا فلا تغیروھا ونھاکم عن اشیاء فلا تنتھکوھا، وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تکلفوھا رحمۃ من ربکم فاقبلوھا،

خدا نے چند باتیں فرض کی ہیں ان کو ضائع نہ کرو اور تمہارے لئے کچھ حدود قائم کر دیئے ہیں ان سے بچاؤ نہ کرو، اور چند باتوں سے منع کیا ہے ان سے باز رہو، اور بغیر بھول چوک کے بعض باتوں سے وہ خاموش رہا اُن میں زبردستی کر کے کوشش نہ کرو، خدا نے اپنی رحمت سے ایسا کیا تو اس کو قبول کرو،

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس موقع پر جو تقریر کی ہے وہ

سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں،

"ان مسائل میں تاویل کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور نہ کسی صحابی سے صحیح طریقہ سے مروی ہے، اور نہ اس بات کی ممانعت آئی ہے کہ ان مسائل کو بیان نہ کیا جائے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے حکم تھا کہ جو کچھ تم پر نازل ہو وہ لوگوں کو پہنچاؤ، یہ بھی خدا نے فرمادیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم "آج اے مسلمانو! میں نے تمہارا دین کامل کر دیا" اور باوجود اس کے آپ ان مسائل کا ذکر نہ فرمائیں، یہ محال ہے اور اس کی تمیز نہ ہو سکے کہ خدا کی طرف کن صفات کی نسبت ہو سکتی ہے اور کن کی نہیں ہو سکتی، حالانکہ آپؐ نے تمام صحابہ کو تاکید فرمادی تھی کہ جو لوگ آپؐ کے سامنے موجود ہوں وہ آپؐ کے احکام ان لوگوں تک پہنچادیں جو موجود نہیں، یہاں تک کہ اسی بنا پر آپؐ کی ایک ایک بات، ایک ایک کام، ایک ایک حالت، اور ایک ایک واقعہ جو آپؐ کے سامنے ہوا، اس کو بیان کر دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا اس امر پر اتفاق تھا کہ ایمان اسی طرح لانا چاہیئے جس

طرح خدا چاہتا ہے"۔

حافظ صاحب کا مقصود یہ ہے کہ خدا نے اپنے دین کے متعلق جو کچھ کہنا تھا وہ اپنے پیغمبر کی زبانی انسانوں تک پہنچا دیا، صحابہؓ نے آپؐ سے جو کچھ سُنا وہ اپنے بعد والوں تک پہنچا دیا، یہ مسائل اگر مذہب میں داخل ہوتے تو ضرور ان کی تعلیم ہوتی،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں،-

> "خدا اس سے بالاتر ہے کہ وہ عقل یا حواس سے دریافت ہوسکے، یا اس میں صفتیں اس طرح موجود ہوں کہ جس طرح عوارض جوہر میں ہوکر پائے جاتے ہیں، یا وہ اس طرح ہوں جن کو عام عقلیں ادراک کرسکیں، یا متعارف الفاظ ان کو ادا کرسکیں، باایں ہمہ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو بتا بھی دیئے جائیں تاکہ جہاں تک انسانیت کی تکمیل ہوسکتی ہے ہوجائے، ایسی حالت میں اس سے چارہ نہیں کہ ان صفتوں کا استعمال ان معنوں میں کیا جائے کہ ان کے نتائج اور لوازم سمجھ لئے جائیں، مثلاً ہم خدا کے لئے "رحمت" ثابت کرتے ہیں اس سے مقصود احسانات کا فیضان ہے، دل کی خاص کیفیت نہیں (جو انسانوں میں پائی جاتی ہے)

اسی طریقہ سے خدا کی وسعتِ قدرت کے اظہار کے لئے مجبوراً ہم کو وہ الفاظ استعارۃً استعمال کرنے پڑیں گے جو انسانوں کی قدرت و قوت کے لئے بولے جاتے ہیں، کیونکہ ان معانی کے ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں، اور اسی طرح تشبیہاً بہت سے الفاظ بولے جائیں گے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان سے حقیقی معنی مراد نہ ہوں بلکہ وہ معانی جو خدا کی ذات کے لائق اور مناسب ہیں، تمام آسمانی مذہب کا اس پر اتفاق ہے کہ صفات اسی طرح پر بولے گئے ہیں اور اس پر کہ یہ الفاظ اسی طرح بولے جائیں، اور اس کے علاوہ کوئی اور بحث وکاوش نہ کی جائے اور یہی مذہب اس زمانہ کا تھا جس کی خیر و برکت کی شہادت دی گئی ہے (یعنی تبع تابعین کے عہد تک) اس کے بعد کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہو گئے جنہوں نے بغیر کسی نص قطعی اور دلیل مستحکم کے ان مسائل میں فکر وکاوش شروع کردی"۔

شاہ صاحب اپنے وصایا میں جو فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے لکھتے ہیں :-

"اول وصیتِ ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت در اعتقاد و عمل، پیوستہ بتدبیر ہر دو مشغول شدن و در عقائد مذہب **قدماء** اہل سنت اختیار کردن و آں را تفصیل و تفتیش آنچہ سلف تفتیش نکردند اعراض نمودن و بہ تشکیکات خامِ معقولیان التفات نکردن۔"

شاہ صاحبؒ اپنے رسالہ تاویل الاحادیث میں فرماتے ہیں،

ثم نشأ ناس ممن یسمّون انفسهم اهل السنة والسنة منهم بمراحل، فتکلفوا مالا یعنیهم، ولم یات به نبیهم فیالهم من مصیبة عمت فاھمت والله المستعان۔	اسکے بعد کچھ لوگ پیدا ہوئے جو اپنے کو اہلِ سنّت کہتے ہیں حالانکہ سنّت ان سے بمراحل دُور ہے تو انہوں نے اس میں تکلیف سے بات کہی جس کی ضرورت نہ تھی، اور نہ جس کو ان کے رسول لیکر آئے تھے تو ہائے وہ مصیبت جو لوگوں میں پھیل گئی اور اس نے اندھا بنا دیا۔

پھر رسالہ کے آخر میں فرماتے ہیں،

ولایذھب علیك ان الطریق المستقیم فی ھذہ المسئلۃ ومایشبھھا من التشبیھات کالید والرجل ومن المعادیات وغیرھا ان یمر الانسان علی ظواھرھا ولا یشتغل بکیفیۃ وجودھا، ویعتقد فی الجملۃ ان ماارادالله ورسولہ حق ولا یقول ھذا ولم یرد ھذا، و نحو ذلك، ولذلك نری النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا اصحابہ ولا التابعین لھم باحسان یشتغلون بشیٔ من ذالك وانما

تم سے یہ مخفی نہ رہے کہ اس مسئلہ میں اس قبیل کے تشبیہات کے دوسرے مسئلوں میں جیسے اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ اور پاؤں کا استعمال، اور قیامت ومعاد وغیرہ کے مسئلوں میں صحیح اور سیدھا طریقہ یہ ہے کہ انسان ان کو ان کے ظاہر مطلب پر رکھے، اور ان کے وجود کی کیفیت سے بحث نہ کرے، اور مجملاً یہ عقیدہ رکھے کہ ان سے اللہ اور رسول کی جو مراد ہے وہ حق ہے، اور نہ کہے کہ یہ مراد ہے اور یہ مراد نہیں ہے اور نہ اس قسم کی باتیں کریں، ہم دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صحابہ نے اور نہ تابعین نے ان میں سے

جاء الاشتغال به من المعتزلة حين استرقوا من الفلاسفة واسترق اهل السنة من المعتزلة، فدخل فيهم ایضاً،

کسی چیز سے بحث فرمائے یہ بحث ومباحثہ اوّل معتزلہ نے شروع کیا، جب انہوں نے فلسفیوں سے ان باتوں کو چرایا، اور اہل سنت نے ان کو معتزلہ سے چُرایا، تو یہ چیز ان کے اندر بھی داخل ہوگئی۔

اب ہم کو اپنے بیان کردہ گزشتہ اصول کلیہ کو جزئی مسئلوں میں دکھا کر ثابت کرنا ہے کہ "قدمائے اہل سنّت" اور اس عہد کے اعتقادات ان مسائل میں کیا تھے، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر و برکت کا زمانہ فرمایا ہے،

مسئلہ تقدیر یا جبر و قدر اعتقادیات میں سب سے پہلے اسی مسئلہ میں گفتگو پیدا ہوئی، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا جواب نہ صرف مذہب بلکہ فلسفہ کی زبان سے بھی مشکل ہے، یہ نہ صرف اسلام کا مسئلہ ہے بلکہ دنیا کا کوئی مذہب اس سے خالی نہیں، اور درحقیقت مذہب کی روح اسی معجز العقول معمّا کے اندر پوشیدہ ہے، اس کا جواب نفیاً یا اثباتاً ادّعائی لہجہ میں دینا مذہب پر ایک خطرناک حملہ ہے،

احادیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ باہر تشریف لائے، دیکھا کہ کچھ اصحاب بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں، دریافت فرمایا کہ کس مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہو، عرض کی مسئلہ قدر پر، یہ سنکر آپ اس قدر برافروختہ ہوئے کہ چہرہ سُرخ ہو گیا، راوی کا بیان ہے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے روئے مبارک پر انار کے دانے نچوڑ دیئے ہیں، اور فرمایا تم سے پہلی قومیں اسی میں ہلاک ہوئیں ہیں تاکید کرتا ہوں کہ اس میں جھگڑا نہ کرو،[1]

حضرت قاسم بن محمدؒ، حضرت صدیق اکبرؓ کے پوتے، اور مدینہ کے دارالفقہ کے رکن اعظم تھے، ایک دفعہ دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے مسئلہ قدر میں گفتگو کر رہے ہیں فرمایا،

کُفُّوا عَمَّا كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ[2] جس سے اللہ تعالیٰ خاموش رہا تم بھی خاموش رہو۔

پس اس پر یہ عقیدہ کافی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ہے، اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے،

صفات: اللہ تعالیٰ کے صفات اور اسماء حُسنیٰ کے متعلق صحیح راستہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے صفات کے دو اصول بتائے ہیں، ایک تو یہ کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے صفات بیان کئے ہیں،

---

[1] ترمذی، قدر، حدیث غریب [2] ابن سعد جز مدینہ، تذکرہ قاسم بن محمد،

سمیع (سننے والا) اور بصیر (دیکھنے والا) وغیرہ صفات اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کئے ہیں، اس لئے وہ ان صفات حسنۂ کمالیہ سے متصف ہے اور وہ صفات اس کیلئے ثابت ہیں، دوسرا اصول یہ ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں) اس لئے ان صفات کی صورت اللہ تعالیٰ میں ایسی نہیں جو بندوں کی صفات کے مثل ہو، لَهٗ سَمْعٌ لَا كَسَمْعِنَا، وَلَهٗ بَصَرٌ لَا كَبَصَرِنَا، وہ سنتا ہے مگر ہمارے سننے کی طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، بلکہ وہ اس طرح سنتا اور دیکھتا ہے جو اس کی شانِ عالی کے لائق ہے، اس کی کوئی صفت بندہ میں نہیں پائی جاتی اور نہ بندہ کی کوئی صفت اس میں پائی جاتی ہے، سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ، اللہ تعالیٰ پاک ہے اس سے جس کو مشرک اللہ میں شریک بتاتے ہیں۔

قرآن کو حادث وقدیم یا مخلوق وغیر مخلوق کہنا **محمد** رسول اللہ ﷺ کے معتقدات کی فہرست میں داخل نہ تھا، اسلام کی دعوت صرف یہ ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے، اور یہ کہ اس کے من اللہ ہونے کا یقین کامل رکھا جائے،

سفیان بن عینیہ اکابر اہلِ سنّت میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے نہایت غضب ناک ہو کر فرمایا،

ویحکم القرآن کلام اللہ قد صحبت   افسوس تم پر قرآن خدا کا کلام

الناس وادرکتھم، ھذا عمرو بن دینار، وھذا ابن المنکدر حتی ذکر منصور، والاعمش ومسعر بن کدام فقال ابن عینیہ قد تکلموا فی الاعتزال والرفض، والقدر، وامروا باجتناب القوم، فما نعرف القرآن الا کلام اللہ ومن قال غیر ھذا فعلیہ لعنت اللہ،

(خلق افعال العباد بخاری)

ہے" میں نے بزرگوں کی صحبتیں اٹھائی ہیں، ان کا زمانہ پایا ہے، یہ ابن دینار یہ ابن منکدر یہاں تک کہ انہوں نے منصور، اعمش، مسعر ابن کدام کا بھی نام لیا، ان لوگوں نے معتزلہ، روافض، اور قدریہ پر اعتراضات کئے اور ان سے بچنے کی تاکید کی، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے اس کے سوا جس نے اور کچھ کہا اس پر خدا کی لعنت،

حافظ ابو احمدؒ کہتے ہیں،

مایعرف من الصحابۃ رضی اللہ عنھم الخوض فی القرآن.

صحابۂ کرام سے قرآن میں مطلق بحث منقول نہیں،

منصور بن عمار ایک محدث ہیں، ان سے کسی نے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ کلامِ الٰہی عین خدا ہے یا جزء خدا ہے، انھوں نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ ہم سب کو فتنہ سے بچائے **اہل السنۃ والجماعۃ**

میں سے بنائے، پیغمبروں کے بعد بندوں کے لئے خدا پر کوئی حجت نہیں ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کی نسبت یہ بحث بدعت ہے، جس میں سائل اور مجیب دونوں شریک ہیں، سائل اس میں پڑتا ہے جو اس پر فرض نہیں اور مجیب بہ تکلف وہ کرتا ہے جو اس پر فرض نہیں، خدا کے سوا میں کسی کو خالق نہیں کہتا اور اس کے سوا سب مخلوق ہے، قرآن خدا کا کلام ہے، اس کے بعد رک جاؤ، قرآن کی کوئی صفت اپنی طرف سے نہ کرو ورنہ گم راہ ہو گے"۔

(جزء افعال العباد بخاری)

اسی قسم کے اقوال اور ائمہ سے بھی ثابت ہیں۔

استواء، اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے، اور ہر جگہ ہے، قرآن مجید میں یہ دونوں باتیں مذکور ہیں۔ یہ بھی ہے کہ،

أَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ   جدھر منہ پھیرو اُدھر ہی خدا ہے

یہ بھی مذکور ہے،

الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى   خدا تخت پر برابر ہوا۔[1]

بعض ائمہ ان آیتوں کے معنی یہ لیتے ہیں کہ خدا وجوداً آسمان پر ہے، لیکن اپنے علم کی رو سے وہ ہر جگہ ہے، **جہمیہ** کا اعتقاد یہ ہے کہ خدا اپنے وجود کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے۔ **امام مالک**رح سے

---

[1] حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اسکا ترجمہ "جا براجا" کیا ہے

کسی نے الرحمٰن علی العرش استویٰ کے معنی دریافت کیے، انھوں نے سُن کر سر جُھکا لیا، پھر فرمایا،

الاستواء معلوم والکیف مجھول والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعۃ۔	استواء کے معنی معلوم ہیں اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی نسبت بحث وسوال کرنا بدعت ہے،

درحقیقت امام مالکؒ نے ان چند فقروں میں قدمائے اہل السنۃ کے اصولِ کلیّہ کی تعلیم فرمادی ہے، یہی وہ اصول ہے جو ہر قسم کے ایرادات اور اعتراضاتِ عقلی کے لئے سپر ہے، انھوں نے اس کی وجہ بھی ظاہر کردی ہے، انھوں نے کہا کہ اگر تمہارے اعتقادات کی بنیاد جدل ومناظرہ اور دلائل عقلی پر ہے تو بالکل ممکن ہے کہ کل تم سے زیادہ پُرزور اور بولنے والا آدمی تمہارے سامنے آجائے، اور اپنے دلائل سے تمہیں مغلوب کردے، توکیا تم اپنا مذہب چھوڑ دوگے، اور پرسوں اس سے زیادہ طبیعت دار اور چلتا ہوا تم سے دوبدو ہو اور وہ کل کے دلائل کو جن کو سُن کر تم قائل ہو گئے تھے پرزہ پرزہ کردے تو کیا پھر اپنا نیا مذہب بھی بدل[1] دوگے اور اسی طرح ہر نئے

---

[1] جامع بیان العلم ابن عبد البر صفحہ ۱۵۵، مصر،

دن کے آفتاب کے ساتھ تمہارا مذہب نکلتا ڈوبتا رہے گا۔

بعض شبہات کا ازالہ، یہ پورا سلسلۂ مضمون پڑھ کر ممکن ہے کہ بعض صاحبوں کو یہ شک پیدا ہو کہ اہل السنۃ مذہب کا عقل کے موافق ہونا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔

اس سوال کے حل کرنے میں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں، اوّل یہ کہ ہم مذہب کو جن عقائد و اعمال کا مجموعہ سمجھتے ہیں ان کا اس قدر حصّہ جس کو صاحبِ شریعتؐ نے ہم پر کھول دیا ہے اور جو درحقیقت مذہب ہے اس نے اس کے تمام اصول و فروع بھی ہم کو بتا دیئے ہیں اس کا ایک ذرّہ خلافِ عقل نہیں ہے، اس کے دلائل وہی صحیح ہیں جو خود شریعت نے اپنے دعوؤں کے ساتھ پیش کئے ہیں اور وہ تمام تر عقل کے مطابق ہیں، لیکن وہ حصّہ جو درحقیقت مذہب کا جزء نہیں، یعنی ہمارے علمِ کلام کے وہ عناصر جو قرآن اور سنّتِ صحیحہ سے ماخوذ نہیں، اور جو باہمی فرقوں کے کلامی مناظروں کی پیداوار ہیں ممکن ہے کہ وہ خلافِ عقل اور مجموعۂ محالات ہوں لیکن وہ درحقیقت ہمارے دین کا جزء نہیں،

(۲) دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب ہم ایک شئے کو **خلافِ عقل** کہنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ عقل نے مسلّم طور سے ایک بات پہلے سے طے کر دی ہے، جس

کے دلائل اس قدر مضبوط ہیں کہ وہ ٹوٹ نہیں سکتے، اب مذہب اس کے خلاف دوسری بات کہتا ہے، جس کو مان لینا ایک ثابت شدہ عقلی مسئلہ کو باطل کر دینا ہے، لیکن ذرا غور کیجئے کہ مذہب اور عقل کے درمیان جو مسائل متنازع فیہ کہے جاتے ہیں کیا اُن کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ عقل نے مضبوط اور مستحکم دلائل سے اس طرح ان کو ثابت کر دیا ہے کہ وہ قطعی ہو گئے ہیں، اور ان کے خلاف کہنا ایک ثابت شدہ مسئلہ کا انکار ہے؟ حقیقتاً ایسا نہیں ہے، اس لئے کسی شئے کو **خلافِ عقل** کہہ دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہیئے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری عقلیں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتیں، اور یہ سچ ہے،

مشکلِ عشق نہ در حوصلۂ دانشِ ماست
حلِ ایں نکتہ بایں فکر خطا نتواں کرد

(۳) آخری اعتراض آپ یہ کر سکتے ہیں کہ اس اصول کے مطابق تو اسلام کے خلاف مذاہب پر بھی کوئی عقلی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی صحت کا معیار بھی عقل نہیں ہو سکتی، لیکن ہم یہ کہیں گے کہ **اسلام** نے جن مسائل کی تلقین کی ہے وہ سرتا پا عقلی ہیں، اور جب ان کے مخالف یا متضاد کوئی ہدایت کسی مذہب میں ہے تو درحقیقت وہ خلافِ عقل ہے اور اس کی صحت کا

جائزہ عقل ہی سے لیا جا سکتا ہے، ہمارا مقصدِ اصلی اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ قرآن اور سنّتِ صحیحہ نے بتا دیا ہے کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہے اور اسی پر آپ کو اکتفا کرنا چاہیئے اور جو نہیں بتایا ہے۔ اس کی تشریح اس میں زیادتی، یا اس میں کمی، بذریعہ عقل جائز نہیں، یعنی اس راستہ پر ہم کو اپنی روشنی سے نہیں بلکہ خدا کی دی ہوئی روشنی کے سہارے سے چلنا چاہیئے۔

(۴) آخر میں ایک اور غلطی دُور کر لینا چاہیئے، میری تقریر سے یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ عقل بیکارِ محض ہے، بلکہ وہ محدود العلم ہے ہمارے حواس جو ہماری عقل کے ذرائع علم ہیں ان سے ہماری عملی عقل جو معلومات حاصل کرتی ہے، ان سے بڑھ کر آگے ماورائے محسوسات میں وہ بے کار ہے، اور یہ عقل کی تحقیر نہیں، بلکہ اس کے علم کے دائرہ کی واقعی تحدید ہے، بصارت ایک خاص فاصلہ سے آگے نہیں دیکھ سکتی، سماعت اپنے عمل کے لئے ایک مخصوص دائرہ چاہتی ہے جس کے بعد وہ بے کار ہے، اسی طرح عقلِ انسانی ایک محدود دائرہ رکھتی ہے جس کے بعد وہ بے کار ہے، اور نیز جس طرح ہر حاسہ اپنے خاص کام کے علاوہ دوسرا کام انجام نہیں دے سکتا، اسی طرح عقلِ انسانی بھی اپنے خاص دائرۂ عمل کے سوا دوسرا کام انجام نہیں دے سکتی، جو شخص اس بات کا شاکی ہے کہ ہم مادّیات

میں رہ کر اپنی عقل کے ذریعہ سے ماورائے مادہ کے حالات سے کیوں واقف نہیں ہوسکتے، اس کو سب سے پہلے یہ شکایت کرنی چاہئے کہ لکھنؤ میں رہ کر ہم کو لندن کی عمارتیں کیوں نظر نہیں آتیں، اور ہندوستان میں ہم کو فرانس کے میدان جنگ کی توپوں کی آوازیں کیوں سنائی نہیں دیتیں ؟

اہل السنّۃ کے عقائدِ صحیحہ[1]،

عقائد کی افادیت: یہ سارے مباحث جو اوپر گزرے، یہ حقیقت میں عقلی کشمکش اور ذہنی الجھاؤ کو عقل کی راہ سے سلجھانے کی کوشش ہے، حالانکہ اس کے متعلق فیصلہ ہے کہ

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

اس لئے عملی حیثیت سے ان الجھنوں میں پڑنے سے نہ کوئی فائدہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، اسی لئے اسلام نے صرف اُن عقائد پر زور دیا ہے جو انسان کے اعمال و اخلاق و کردار پر مؤثر ہوں، جو اس کو خیر اور نیکی کی طرف دعوت دیں، اور بُرائی۔ اور شر سے اس کو بچائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توحید کا منشا یہ ہے کہ اس کے سوا نہ کوئی نافع ہے، اور نہ ضار، نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، ہر حالت میں اسی کو پکارنا چاہیئے، اور اسی سے غیبی مدد مانگنا چاہیئے اس کے سوا کسی کا کوئی حقیقی ملجا و ماویٰ نہیں، وہ اپنے تمام صفات میں ہمہ کمال ہے، تمام اوصافِ حسنہ اور اسماءِ حسنیٰ کا وہ جامع ہے، اسی کا حکم ہے جو ساری دنیا میں جاری ہے، وہ جو

---

[1] "از تکمیل الدین" حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ،

چاہتا ہے وہ کرتا ہے ، اور جس کا چاہے حکم دیتا ہے، وہی گناہوں کو معاف کرتا ہے وہی غیب کا حال جانتا ہے ،

غرض اپنے ان تمام اوصافِ حسنہ کی تعلیم بندہ کو اس لئے دی ہے کہ بندہ کو خدا کی معرفت حاصل ہو، اور بندہ اس کے اوصافِ جمالیہ کی بناء پر اس سے محبت کرے اور اس کے اوصافِ جلالیہ کا خیال کرکے اس سے ڈرے ،اور خدا کے اچھّے صفات کا عکس اپنے اندر پیدا کر سکے ،

اہل سنّت کے عقائد : یہ چند باتیں بطور مثال کے لکھی ہیں، اسی طرح دوسرے عقائد بھی ہیں، جن کا اثر بندہ پر کسی نہ کسی طرح پڑتا ہے ، اور وہ اُن سے معرفت یا عمل کا فائدہ اٹھاتا ہے ، ذیل میں ہم ان عقائد کو جو اہل سنّت کے نزدیک مسلّم ہیں اس غرض سے درج کرتے ہیں تاکہ عامۂ مسلمان اہل سنّت کے عقائدِ مسلّمہ پر مطلع ہوں، اور اس سے اپنے عقیدہ کی تصحیح کریں، تاکہ ایمان صحیح و کامل نصیب ہو.

اہل سنّت کے عقائد کا سب سے مختصر مضمون تو یہ ہے،

اَشہد ان لا الٰہ الا اللہ وانّ	میں زبان اور دل سے گواہی
محمدا رسول اللہ ،	دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی
	معبود نہیں اور محمد اللہ کے

رسول ہیں۔

اس شہادت کے فقرۂ اُولیٰ کو شہادتِ توحید، اور فقرۂ ثانی کو شہادتِ رسالت کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ بندہ جب اللہ کے سوا اور کو معبود نہیں مانتا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول دل وجان سے تسلیم کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس قدر احکام نازل ہوئے، ان سب کو وہ مانتا ہے،

لیکن اس اجمال کے بعد مزید تفصیل کوئی چاہتا ہے، تو وہ یہ ہے،

آمنت باللہ وملٰئکتہ وکتُبہ ورُسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہٖ وشرّہٖ من اللہ تعالیٰ.	میں ایمان لایا ہوں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اخیر دن پر، اور اس بات پر کہ جو اچھا یا بُرا ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے،

بندہ جب رسولوں اور کتابوں پر ایمان لایا تو سارے صحیح عقیدے اور اللہ تعالیٰ کے سارے احکام ان میں داخل ہوگئے،

لیکن چونکہ یہ بھی مجمل ہیں، اس لئے علماء محققین نے ان امور کو جن کو خاص طور سے خیال میں رکھنا چاہیئے، کتاب وسنّت سے لے کر یکجا کر دیا ہے تاکہ ہر مسلمان ان کو خوب سمجھ کر مان لے، تاکہ اس کے مطابق اس کے دین کے سارے کام درست ہو جائیں،

اوّل ایمان باللہ، سب سے پہلا اور سب سے اہم بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ان صفات کے ساتھ مانیں جن کو اللہ اور رسول نے بتایا ہے، یعنی ہم یہ دل سے مانیں اور زبان سے اقرار کریں کہ اللہ ایک ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا وہ کسی کا محتاج نہیں، اور ساری چیزیں اس کی محتاج ہیں، اس کی تمام صفتیں اچھی ہیں اور وہ ہر بُرائی سے پاک ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ سنتا اور دیکھتا ہے، وہ چُھپے اور کُھلے ہر شے کا علم رکھتا ہے، اس کو موت نہیں آتی، اس کو نیند نہیں آتی، دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں پہلے ناپید تھیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے اور مشیّت سے ان کو پیدا کیا اور وہ جب چاہے ان کو فنا کر دے، وہ کلام کرتا ہے، اس کا کوئی ساجھی اور ساتھی نہیں، اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کے ماں اور باپ ہے، اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے، وہ ان سارے جسمانی رشتوں سے پاک ہے، وہ

ساری دنیا کا بادشاہ ہے، اس کے حکم سے کوئی باہر نہیں، نہ اس کی قدرت سے کوئی چیز خارج ہے ، وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے، وہی پیدا کرتا ہے، اور وہی موت دیتا ہے، وہی اپنے بندوں کو سب آفتوں سے بچاتا ہے اور وہی عزّت والا ہے، بڑائی اور عظمت اور کبریائی والا ہے، گناہوں کا بخشنے والا ہے، زبردست ہے، بہت دینے والا ہے، روزی پہنچانے والا ہے جس کی روزی چاہے تنگ کرے، جس کی چاہے فراخ کرے، جس کو چاہے عزّت دے اور جس کو چاہے ذلّت دے، جس کو چاہے پست کرے، جس کو چاہے بلند کرے۔

صِفات، خالقِ تعالیٰ میں مخلوق کی سی کوئی صفت نہیں پائی جاتی، اور نہ خالق تعالیٰ کی سی کوئی صفت مخلوق میں پائی جاتی ہے، قرآن اور حدیث میں بعض جگہ جو ایسی باتوں کی خبر دی گئی ہے تو یا تو ان کے معنی کو اللہ کے سپرد کریں کہ وہی اس کی حقیقت جانتا ہے اور ہم بے کھود کُرید کئے ہوئے ایمان اور یقین کرلیں اور یہی بہتر ہے، یا پھر کچھ مناسب معنی اس کے لگالئے جائیں، جس سے وہ سمجھ میں آجائے، جیسا کہ علمائے متاخرین نے اختیار کیا ہے،

ایمان بالقدر، عالم میں جو کچھ بھلا بُرا ہوتا ہے سب کو اللہ تعالےٰ اس کے ہونے سے پہلے ہمیشہ سے جانتا ہے اور اپنے

جاننے کے موافق اس کو پیدا کرتا ہے، تقدیر اسی کا نام ہے،

جبر و قدر۔ بندوں کو اللہ تعالیٰ نے سمجھ اور ارادہ دیا جس سے وہ گناہ اور ثواب کا کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں، مگر بندوں کو کسی کام کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں ہے، گناہ کے کام سے اللہ تعالیٰ ناراض اور ثواب کے کام سے خوش ہوتے ہیں۔

تکلیف مالا یطاق۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم نہیں کیا جو بندوں سے نہ ہو سکے،

عدم وجوب اصلح۔ کوئی چیز خدا کے ذمّہ ضروری نہیں وہ جو کچھ مہربانی کرے اس کا فضل ہے،

ایمان بالرسالت، اللہ تعالیٰ نے بندوں کو سمجھانے اور سیدھی راہ بتانے کو بہت سے پیغمبر بھیجے، ان پیغمبروں کو خدا نے اپنے ارادہ اور پسند سے برگزیدہ کیا، وہ سب گناہوں سے پاک ہیں ان آنے والے پیغمبروں کی پوری گنتی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے،

معجزات، ان کی سچائی بتانے کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں ایسی مشکل باتیں کرائیں، جو اور لوگ نہیں کر سکتے، ایسی باتوں کو معجزہ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے ذریعہ اپنی ہدایتوں، تعلیموں اور حکموں پر مطلع فرمایا، اور ان پیغمبروں نے ان کو سُن کر اپنے زمانہ کے لوگوں تک پہنچایا، اس کو وحی کہتے ہیں

ان پیغمبروں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور سب سے آخر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی درمیان ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا شخص نبوت پر سرفراز ہو کر نہیں آئے گا، اور جو ایسا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے نبوت ورسالت کا منصب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو گیا، قیامت تک جتنے آدمی اور جن ہوں گے سب کے آپ ہی پیغمبر ہیں،

ہاں پیغمبروں میں سے بعضوں کا مرتبہ بعضوں سے بڑا ہے سب میں زیادہ مرتبہ ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔

معراج ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جاگتے میں جسم کے ساتھ مکہ سے بیت المقدس تک، اور وہاں سے ساتوں آسمانوں پر، اور وہاں سے جہاں تک منظور رہا پہنچایا۔ اور پھر واپس مکہ میں پہنچا دیا، اس کو معراج کہتے ہیں۔

ایمان بالملائکہ۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوقات کو نور سے پیدا کر کے ان کو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ کیا ہے۔ ان کو فرشتے کہتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے تدبیرِ عالم کے بہت سے کام اپنے ارادہ اور مشیت سے کسی مصلحت سے ان کے سپرد کئے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ

کے احکام بجالاتے ہیں، اور اپنے سپرد شدہ کاموں کی انجام دہی میں کبھی سرتابی یا نافرمانی نہیں کرتے، وہ نہ انسانوں کی طرح کھاتے اور پیتے ہیں، اور نہ انسانوں کی طرح مرد اور عورت ہیں،

شیاطین وجنات ، اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوقات آگ سے پیدا کئے ہیں اور ان کو ہماری نظروں سے پوشیدہ کیا ہے ان کو جن کہتے ہیں، ان میں نیک و بد سب طرح کے ہوتے ہیں، ان کے اولاد بھی ہوتی ہے، ان سب میں سب سے زیادہ مشہور شریر ابلیس یا شیطان ہے، جو لوگوں کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے اور ان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے،

اولیاء مسلمان جب خوب عبادت کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حکموں پر پوری طرح چلتا ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریقہ پر عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو محبوب رکھتے ہیں، ایسے شخص کو ولی کہتے ہیں،

کرامت ایسے شخص کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ بعض ایسی باتیں ظاہر کرتا ہے، جو اور لوگوں سے نہیں ہوسکتیں، تو ایسی باتوں کو کرامت کہتے ہیں، ولی خواہ کتنا ہی بڑا ہوجائے مگر نبی کے برابر نہیں ہوسکتا، وہ خدا کا کیسا ہی پیارا ہوجائے مگر جب تک اس کے ہوش و حواس درست ہیں شرع کا پابند رہنا فرض ہے، نماز

روزہ، اور کوئی فرض عبادت معاف نہیں ہوتی، اور جو گناہ کی باتیں ہیں وہ اس کے لئے درست نہیں ہوجاتیں،

جو شخص شرع کے خلاف ہو وہ خدا کا دوست یا ولی نہیں ہوسکتا،

کشفِ اولیاء، اولیائے الٰہی کو بھید کی بعض باتیں سوتے یا جاگتے میں معلوم ہوجاتی ہیں، ان میں جو شرع کے موافق ہو وہ قبول ہے، اور اگر خلاف ہے تو رَد ہے،

بدعت، اللہ اور رسولؐ نے دین کی سب ضروری باتیں قرآن وحدیث میں بندوں کو بتادی ہیں، اب دین میں کوئی نئی بات نکالنا جو دین میں نہیں، درست نہیں، ایسی نئی بات کو بدعت کہتے ہیں، بدعت بہت بڑا گناہ ہے،

اجتہاد، دین کی بعض ایسی باتیں جو صریحاً قرآن وحدیث میں بعینہٖ مذکور نہیں ہیں، دین کے بڑے بڑے عالموں نے جن کو قرآن وحدیث کے علم میں کمال تھا، اپنے علم وفہم کے زور سے قرآن وحدیث سے نکال کر بیان کی ہیں، وہ بدعت نہیں ہیں، ایسے عالموں کو مجتہد کہتے ہیں، جن میں سے چار مشہور ہیں ۱، امام ابوحنیفہ ۲، امام شافعی ۳، امام مالک ۴، امام احمد بن حنبل،

ایمان بالکتاب، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر مختلف

زبانوں میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں اتاریں، جن میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ سے اُن کی امتوں کو اپنے احکام اور ہدایات سے مطلع فرمایا، ان میں چار کتابیں بہت مشہور ہیں، توراۃ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی، زبور جو حضرت داؤد علیہ السلام کو ملی، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور قرآن مجید ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو، یہ قرآن مجید آخری کتاب ہے اب اس کے بعد کوئی آسمانی کتاب نہیں آئے گی، اس کتاب کی کسی ادنیٰ بات کے بھی انکار کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے، قیامت تک قرآن کا حکم چلتا رہے گا، دوسری آسمانی کتابوں کو گمراہ لوگوں نے بہت کچھ بدل ڈالا، مگر قرآن مجید کی نگہبانی کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے، اس کو کوئی بدل نہیں سکتا،

صحابی ، ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مسلمان نے دیکھا اس کو صحابی کہتے ہیں، ان کی اعلیٰ قدر مراتب بڑی بڑی بزرگیاں آئی ہیں، ان سب سے محبت اور اچھا گمان رکھنا چاہیئے اگر کوئی لڑائی جھگڑا ان کا سننے میں آئے تو اس کو ان کی بھول چوک سمجھے، بُرائی نہ کرے، ان سب میں بڑھ کر چار صحابی ہیں،

۱ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، پیغمبر صاحب کے بعد ان کی جگہ پر بیٹھے، اور دین کا بندوبست کیا، اسی لئے یہ اوّل خلیفہ کہلاتے

ہیں، تمام امت میں یہ سب سے بہتر ہیں، ان کے بعد ۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ، یہ دوسرے خلیفہ ہیں، ان کے بعد ۳) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، یہ تیسرے خلیفہ ہیں، ان کے بعد ۴) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، یہ چوتھے خلیفہ ہیں،

اہل بیت . پیغمبر صاحب کی اولاد اور بیبیاں سب تعظیم کے لائق ہیں، اولاد میں سب سے بڑا رتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ہے اور بیبیوں میں حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں تمام مسلمانوں کی مائیں ہیں، اسی لئے ان کا احترام کریں، اور اہل بیت سے محبت رکھیں،

کفر کی بعض باتیں . ایمان جب درست ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول کو سب باتوں میں سچا سمجھے، اور ان کو دل سے مانے، اور زبان سے اس کا اقرار کرے، اور عمل سے ظاہر کرے، اور اللہ و رسولؐ کی کسی بات میں شک کرنا، یا اس کو جھٹلانا، یا اس میں عیب نکالنا، یا اس کے ساتھ مذاق اڑانا. ان سب باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے،

قرآن و حدیث کے کھلے کھلے مطلب کو نہ ماننا، اور ایچ پیچ کر کے اپنے مطلب بنانے کو معنی گھڑنا بد دینی کی بات ہے، گناہ

کو حلال سمجھنے سے ایمان جاتا رہتا ہے، گناہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو جب تک اس کو بُرا سمجھے اس سے ایمان نہیں جاتا، البتہ کمزور ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو جانا، یا اس کی رحمت سے مایوس ہو جانا کفر ہے کسی سے غیب کی باتیں پوچھنا اور اس کا یقین کرنا کفر ہے، البتہ نبیوں کو وحی سے اور ولیوں کو کشف و الہام سے، اور عام لوگوں کو نشانیوں سے کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے، کسی کا نام لے کر کافر کہنا یا لعنت کرنا بڑا گناہ ہے، ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظالموں پہ لعنت جھوٹوں پر لعنت، مگر جن کا نام لے کر اللہ و رسولؐ نے لعنت کی ہے یا ان کے کفر کی خبر دی ہے، ان کو کافر و ملعون کہنا گناہ نہیں ہے، گناہ کے ارتکاب سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا، صرف گنہگار ہوتا ہے، ایسا شخص توبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ سے دل سے معافی چاہے تو، اللہ تعالیٰ معاف فرما سکتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو توبہ کئے بغیر بھی وہ معاف کر سکتے ہیں،

پچھلے دن پر ایمان، اس سے یہ مقصد ہے کہ موت کے بعد سے لے کر قیامت تک اور قیامت کے بعد جنت اور دوزخ کے جو احوال اور واقعات قرآن و حدیث سے ثابت ہیں، ایک مسلمان کا فرض ہے کہ دل سے ان کو صحیح یقین کرے اور زبان سے ان کا اقرار کرے، ان میں کسی ایسے واقعہ کا انکار جو قرآن اور حدیث

سے ثابت ہے کفر ہے، اور اس میں ایسا ایچ پیچ کر کے مطلب نکالنا جو عبارت کے صاف و صریح مطلب کے خلاف ہو بد دینی ہے،

جس وقت انسان پر موت کے آثار طاری ہوتے ہیں اس پر برزخ کے احوال منکشف ہونے لگتے ہیں، اب یہ توبہ کا وقت نہیں. اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی،

موت جس کے مقرر فرشتے مردہ کے جسم سے رُوح نکالتے ہیں، نیک لوگوں کی آسانی سے نکلتی ہے. اور بُرے لوگوں کی بڑی سختی اور تکلیف سے نکلتی ہے، اور اسی وقت سے جزا اور سزا کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے،

جب آدمی مرجاتا ہے اگر دفن کیا جائے تو گاڑنے کے بعد اور اگر دفن نہ کیا جائے تو جس حال میں ہو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ تیرا پروردگار کون ہے، تیرا دین کیا ہے. اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں، اگر وہ ایمان دار ہوا تو ٹھیک ٹھاک جواب دیتا ہے، پھر اس کے لئے سب طرح کا چین ہے، اور فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ آرام کی نیند سو جا. اور اگر وہ مردہ ایمان سے محروم ہوا تو وہ ہر سوال کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ مجھے خبر نہیں، تو پھر اس کے ساتھ سختی اور سزا کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے،

بعضوں کو اللہ تعالیٰ اس امتحان سے معاف فرمادیتا ہے مگر یہ باتیں مردے کو معلوم ہوتی ہیں، ہم لوگ نہیں دیکھ سکتے، جیسا سوتا ہوا آدمی خواب میں سب کچھ دیکھتا ہے، اور آرام اور تکلیف اٹھاتا ہے، اور اس کے پاس بیٹھا ہوا دوسرا جاگتا آدمی اس سے بالکل بے خبر رہتا ہے،

مُردے کے لئے دعا کرنے سے یا کچھ خیرات دے کر بخشنے سے اس کو ثواب پہنچتا ہے، اور اس سے اس کو فائدہ پہنچتا ہے،

خدا اور رسول نے قیامت کی جتنی نشانیاں بتائی ہیں، سب ضرور ہونے والی ہیں، امام مہدی علیہ السلام ظاہر ہوں گے، اور خوب انصاف سے بادشاہی کریں گے، کانا دجّال نکلے گا، اور دنیا میں بہت فساد مچائے گا، اس کے مار ڈالنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام آسمان سے اتریں گے اور اس کو مار ڈالیں گے،

یاجوج ماجوج دو زبردست قومیں ہیں، وہ تمام روئے زمین پر پھیل پڑیں گی، اور فساد برپا کریں گی، پھر خدا کے قہر سے ہلاک ہوں گی، ایک عجیب طرح کا جانور زمین سے نکلے گا، اور آدمیوں سے باتیں کرے گا، آفتاب مغرب کی طرف سے نکلے گا، اور قرآن مجید اُٹھ جائے گا، اور چند روز میں تمام مسلمان ہلاک ہو جائیں گے،

اور تمام دنیا کافروں سے بھر جائے گی، کوئی اللہ کا نام لیوا باقی نہیں

رہے گا۔ اور بہت سی باتیں ہوں گی، جب ساری نشانیاں پوری ہوجائیں گی تب قیامت کا سامان شروع ہوگا۔

قیامت، ایک فرشتہ جس کا نام اسرافیل ہے، خدا کے حکم سے صور پھونکے گا، جس سے تمام زمین و آسمان اور آفتاب اور تارے اور پہاڑ سب ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے تمام مخلوقات مرجائیں گی۔ اور جو مر چکے ہیں، ان کی روحیں بے ہوش ہوجائیں گی، مگر اللہ تعالیٰ کو جن کو بچانا منظور ہوگا، ان کو بچالیں گے ایک مدت اسی کیفیت پر گذر جائے گی، پھر جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا کہ تمام عالم دوبارہ پیدا ہو، دوسری بار صور پھونکا جائے گا، اس سے پھر سارا عالم موجود ہوجائے گا، مردے زندہ ہوجائیں گے، اور قیامت کے دن میدان میں سب اکٹھے ہوجائیں گے۔ اور وہاں کی تکلیفوں سے گھبرا کر سب پیغمبروں کے پاس سفارش کرانے جائیں گے۔ سب بھلے بُرے عمل لئے جائیں گے، ان کا حساب ہوگا۔ اعمال تولئے جائیں گے جن کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ جنت میں جائیں گے، جن کی برائیوں کا پلہ بھاری ہوگا، وہ دوزخ کے مستحق ہوں گے، اور جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی، اللہ تعالےٰ جو چاہے گا ان کے ساتھ معاملہ کرے گا نیکوں کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھوں میں اور بُروں کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھوں میں دیا جائے گا،

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو حوضِ کوثر کا پانی پلائیں گے، جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، لوگوں کو پُل صراط پر سے چلنا ہوگا، جو نیک لوگ ہوں گے وہ اس پار سے اُس پار ہوکر بہشت میں پہنچ جائیں گے، اور جو بد ہیں وہ اس پر سے دوزخ میں گر پڑیں گے،

دوزخ، پیدا ہو چکی ہے، اور اس میں سانپ، بچھّو، آگ اور طرح طرح کا عذاب ہے، دوزخیوں میں جن میں ذرا بھی ایمان ہوگا وہ اپنے اعمالِ بد کی سزا بھگت کر پیغمبروں، اور بزرگوں کی سفارش کے بعد حسبِ مشیئت الٰہی بہشت میں داخل ہوں گے، خواہ وہ کتنے ہی بڑے گناہ گار ہوں اور جو کافر و مشرک ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور ان کو موت بھی نہ آئے گی،

شفاعت، انبیاء علیہم السّلام اور بزرگ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ان گنہگار مومنوں کے حق میں جن کے باب میں مشیت الٰہی کا اشارہ ہوگا، شفاعت کریں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائیں گے،

بہشت، پیدا ہو چکی ہے، اور اس میں باغ، نہریں، میوے عالی شان مکانات، سایہ دار درخت، اور طرح طرح کے ایسے چین اور نعمتیں ہیں، جن کا تصوّر بھی دنیا میں نہیں ہو سکتا، اور یہ سب نعمتیں

لازوال ہوں گی، یعنی نہ اللہ تعالیٰ ان کو چھینیں گے، نہ وہ فنا ہوں گی، بہشتیوں کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوگی، وہاں ان کو نہ کسی کا غم ہو گا اور نہ خوف، اور نہ موت آئے گی،

اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ چھوٹے گناہ پر سزا دیدے یا بڑے گناہ کو محض اپنی مہربانی سے معاف کردے، اور بالکل اس پر سزا نہ دے،

جن لوگوں کے نام لے کر اللہ ورسول نے بہشتی ہونا بتادیا، ان کے سوا کسی کے بہشتی ہونے کا یقینی حکم ہم نہیں لگاسکتے، البتہ اچھی نشانیاں دیکھ کر اچھا گمان رکھنا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنا ضروری ہے، بہشت میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول، اور اللہ تعالیٰ کے دیدار کی نعمت ہے جو بہشتیوں کو بہشت میں نصیب ہوگی، جس کے سامنے تمام نعمتیں ہیچ معلوم ہوں گی،

دنیا میں جاگتے ہوئے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، عمر بھر گو کیسا ہی بھلا برا ہو، مگر جس حالت میں موت آئے اور جس حالت پر خاتمہ ہو۔ اس کے موافق جزاء اور سزا ہوگی،

ربّنا اغفر لنا ذنوبنا وکفّر عنّا سیّئاتنا وتوفّنا مع الابرار

* * *

ضمیمہ

اُن فلسفیانہ اصطلاحات کی مختصر تشریح
جو اس بے نظیر رسالہ میں آ گئے ہیں

از

ہیچمداں مفتخر بہ نسبت حضرت سلیمانؒ

غلام محمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جَوْہَرْ

وہ شے جو بالذات قائم ہو یعنی اپنے قیام میں دوسرے کی محتاج نہ ہو جیسے دیوار اور سایہ کی مثال میں دیوار "جوھر" ہے کہ وہ اپنے قیام میں سایہ کی محتاج نہیں، سایہ رہے نہ رہے وہ اپنی جگہ کھڑی رہے۔

عَرَض

وہ شے جو اپنے قیام میں دوسرے کی محتاج ہو مثلاً اُوپر کی مثال میں سایہ "عرض" ہے کہ وہ اپنے قیام میں دیوار کا محتاج ہے دیوار نہ ہو تو اس کا وجود عدم ہے۔

عَینِیَّت

دو مفہوموں یا یوں کہیئے کہ دو چیزوں کا مصداق ہر طرح سے ایک ہونا کہ ان میں کسی قسم کا فرق نہ ہو سکے "عینیت" کہلاتا ہے۔ مثلاً زید اور ذاتِ زید۔

غَیرِیَّت

دو چیزوں میں سے کسی ایک کا دوسرے کے بغیر موجود ہو سکنا "غیریت" کہلاتا ہے۔ جیسے ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات، کہ گو مخلوق بغیر ذاتِ باری کے موجود نہیں ہو سکتی مگر ذاتِ باری تو بغیر مخلوق کے بھی موجود ہو سکتی ہے، چنانچہ مخلوق کی ایجاد سے پہلے بھی وہ موجود تھی اور مخلوق کو فنا کر کے بھی موجود رہے گی، پس مخلوق اور خالق میں "غیریت" پائی جاتی ہے۔

لَا عَینَ وَلَا غَیر

مذکورہ بالا تعریف غیریت و عینیت کے اعتبار سے جب ذاتِ حق اور اسکی اپنی صفات کو دیکھا جائے تو یہاں نہ عینیت ہی ثابت ہوتی ہے نہ غیریت۔ عینیت تو اس لئے نہیں کہ صفات، ذات سے الگ اور زائد ہیں اور غیریت اسلیئے نہیں کہ ذات اور صفات میں سے ایک بھی چیز ایسی نہیں جو دوسرے کے بغیر پائی جا سکے۔ صفات بغیر ذات کے اسلیئے موجود نہیں ہو سکتیں کہ وہ ذات کے تابع ہیں اور تابع کا اپنے متبوع کے بغیر پایا جانا محال ہے اور ذات بغیر صفات کے اسلیئے پائی نہیں جا سکتی کہ ذات کا صفاتِ کمال سے خالی ہونا

لازم آئے گا جو محال ہے پس دونوں لازم و ملزوم ہوئے ۔ اسی کو لاعین ولاغیر" کہتے ہیں یعنی صفاتِ الٰہیہ نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات ہیں ۔

جبر

نہ صرف فعل کی تخلیق میں بلکہ ارادۂ فعل میں بھی بندہ کا خود کو غیر مختار ماننا "عقیدۂ جبر" ہے ۔ اس عقیدہ کی رُو سے سارا نظام شریعت اور قانون جزا و سزا باطل ٹھیرتا ہے یہ صریح گمراہی اور اسلام سے دُوری ہے ۔

قدر

نہ صرف ارادۂ فعل میں بلکہ اپنے ہر فعل کی تخلیق میں بندہ کا خود کو مختار ماننا "عقیدۂ قدر" ہے ۔ یہ بھی قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآن بندہ کو نہیں بلکہ اللہ کو افعال کا خالق قرار دیتا ہے ، (بندہ محض کاسبِ افعال ہے) ۔ وَ اللهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعلَمُوْنَ

(یعنی اللہ نے پیدا کیا تمہیں بھی اور تمہارے افعال کو بھی) عقیدۂ قدر بھی نہ صرف غیر اسلامی بلکہ عقل و مشاہدہ کے اعتبار سے بھی مضحکہ خیز ہے کیونکہ یہ تو رات دن کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ بندہ اپنے کتنے ہی ارادوں میں ناکام اور حسرت زدہ رہ جاتا ہے ۔

اَلْجُزْءُ الَّذِیْ لَا یَتَجَزّٰی

لفظی معنی تو یہ ہیں کہ ایسا جزو جس کی مزید تقسیم ناممکن ہو اور اصطلاح

میں جزولایتجزیٰ جس کو "جوہرِ فرد" یا "نقطۂ جوہریہ" بھی کہتے ہیں ۔ ایسا ذی وضع جوہر ہے جس کی تقسیم خواہ وہ کسری (یعنی عملی تقسیم) ہو یا وہمی یا فرضی کسی نوعیت کی بھی تقسیم کو وہ جوہر قبول نہ کرے ۔ متکلمین ان اجزا سے جسم کو مرکب بتلاتے ہیں اور فلاسفہ اُن کے برعکس اس کو باطل قرار دیتے ہیں ۔

طُفْرَہ

لغوی معنی چھلانگ لگانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس سے مراد ایک جسم کا مسافت اور اجزائے مسافت کو اسطرح طے کرکے آخری حد پہ پہنچ جانا ہے کہ مسافت کے درمیانی حصوں سے اور انکے محاذ و مقابل سے اس کو گذرنا نہ پڑے نظام معتزلی کے سوا فلاسفہ میں کوئی گروہ بھی اس کا قائل نہیں ۔

رُؤیَت

آنکھ سے دیکھنا رویتِ بصری کہلاتا ہے اور قلب سے دیکھنا رویتِ قلبی یا رویت علمی کہلاتا ہے ۔

اِستطاعَت مَعَ الْفِعْل

"استطاعت" ایک حقیقت ہے جو ہر جاندار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے اور اسی سے اختیاری افعال سرزد ہوتے ہیں اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قدرت حاصل رہتی ہے ۔ معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایک جاندار میں یہ استطاعت فعل کے پہلے ہی سے موجود رہتی ہے ۔ لیکن اشاعرہ اس کے برعکس اس بات کے قائل ہیں کہ استطاعت پہلے سے موجود نہیں رہتی بلکہ عین فعل کے وقت ملتی رہتی ہے اسی کو وہ "استطاعت مع الفعل" سے تعبیر کرتے ہیں ۔

تمت

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کی چند اہم شاہکار تصنیفات

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
جب ایمان کی بہار آئی
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
معرکۂ ایمان و مادیت
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک

نبی رحمت مکمل
پرانے چراغ مکمل
نقوش اقبال
ارکان اربعہ
کاروان مدینہ
قادیانیت
ذکر خیر
تعمیر انسانیت
صحبتے با اہل دل
حدیث پاکستان
پا جا سراغ زندگی
اصلاحیات

ناشر ـــ فضل ربی ندوی ـــــ فون ـ ۶۱۱۸۱۷
مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد مینشن ۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸